تین شاعر

(یعنی)

میر تقی میرؔ، میر انیسؔ اور ہوریس اسمتھ

پر ایک تنقیدی نظر

(از)

ابو الحسنات سید غلام محی الدین قادری زورؔ بی اے

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

۱۹۲۶ء

۱۳۵۱ھ

مطبوعہ

شمس الاسلام پریس واقع چھتہ بازار

حیدرآباد دکن

قیمت عصہ

مصنف کی تمام کتابیں

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے

حاصل ہوسکتی ہیں

فہرست

صفحات

(۱)

(۲)

میر تقی میر اور ان کی مثنویاں

(۳)

میر انیس کی شاعری

(۴)

ہوریس اسمتھ کی شاعری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

ہر قوم کی زندگی اور ترقی ایک حد تک اسکی مادری زبان پر بھی منحصر رہتی ہے، اور زبان میں اسی وقت ترقی ہوتی ہے جب کہ اس میں مختلف الموضوع مباحث پر شدت کے ساتھ تصانیف و تالیف و تراجم کی بارش ہونے لگے خدا کے فضل سے اس مبارک زمانہ میں اردو زبان ترقی کے ایسے مدارج طے کر رہی ہے جو مستقبل قریب میں اسکو معراج کمال تک پہنچا دینے کے ذمہ دار بنتے نظر آرہے ہیں اور وہ وقت طوفانی رفتار کے ساتھ آرہا ہے جب کہ "سلسبیل علوم و فنون اور سرچشمۂ تہذیب و تربیت" **جامعہ عثمانیہ** حیدرآباد دکن کی آبیاریوں اور اس کے موسس اعلیٰ آقائے ولی نعمت **سلطان العلوم** (خلد اللہ ملکہٗ) کی میحانفسیوں کے باعث اردو زبان دنیا کی زندہ اور شگفتہ زبانوں کے ہمدوش ہو جائے گی۔

(۲)

میر تقی میر اور میر انیس ہندوستان کے ان چند زندہ جاوید شاعروں میں سے ہیں جن کے کلام کی وجہ سے اردو دانوں کی ذہنیتوں میں رفعت و عظمت کی خاص جھلکیں نمودار ہو گئی ہیں۔ اگر ان دونوں کے شہ کاروں کو اردو کے خزانہ سے علیحدہ کر لیا جائے تو نہ صرف اردو ایک تہی مایہ زبان ہو جائے گی بلکہ اردو دانوں کو بھی اپنے دل و دماغ میں ایک ایسی پستی محسوس کرنی پڑے گی جس کے بعد ایک عرصہ تک فضائے علم و ادب میں ابھرنا دشوار ہو جائے گا۔

میر تقی نے اردو شاعری کو جس رتبہ تک پہنچا دیا اور شاعروں کے اخلاق و دماغوں میں جس اعلیٰ مذاقی کے تخم بو دئے ان کے متعلق جس قدر بھی لکھا جائے کم ہے تاہم "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ہم نے ان کی مثنویوں کے متعلق جو کچھ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اس کا نتیجہ اس کتاب کے پہلے ستر (۷۰) صفحات میں پیش کیا جاتا ہے اس کے بعد میر انیس کی شاعری کے متعلق مضمون شروع ہو جاتا ہے، میر انیس ہی اردو کے وہ تنہا شاعر ہیں جنہوں نے اپنے اعلیٰ کارناموں کے ذریعہ اسکو دنیا کی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ بنا دیا وہ دنیائے ادب کی ان چند عظیم الشان ہستیوں میں سے ہیں جو خدایان فن کہلاتی ہیں اور مبارک ہے اردو جیسی زبان

جس نے بہت جلد میر انیس جیسا شاعر پیدا کیا۔

میر انیس کی شاعری پر ایک سرسری نظر کے بعد ہورِیس اسمتھ کی شاعری کا ایک تنقیدی مطالعہ اور اسکی مشہور نظم "ایک ممی سے خطاب" (Address to a Mummy in Belzoni's Exhibition) کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے اس مضمون میں ہم نے ہورِیس اسمتھ کے شاعرانہ تخیل اور اس کے نقطۂ نظر کی اس نوعیت کو دکھانا چاہا ہے جو عام طور پر ہر اعلیٰ شاعر کی ایک امتیازی خصوصیت ہوتی ہے "ایک ممی سے خطاب" والی نظم کا ترجمہ ہم نے کلیہ جامعہ عثمانیہ کے مایۂ صد افتخار صدر مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب بالقابہ کی فرمایش سے کیا تھا۔ اس کے بعد اسپر نثر میں بھی ایک مقدمہ لکھا تھا جو اس مجموعہ میں شامل ہے۔

(۳)

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تنقیدی کارنامے ادبیات میں دوسرے درجہ پر رکھے جاتے ہیں اگر اسکو تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے تو اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا جس پر ہم نے بارہا زور دیا ہے اس وقت اردو زبان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تنقیدوں کی شدت کے ساتھ ضرورت ہے اردو کے کئی انشا پرداز اور کارنامے ایسے ہیں جن کی کافی طور پر قدردانی نہیں ہوی اور اردو داںوں میں علم و ادب کا وسیع مذاق نہونے کے باعث ان کو مجبوراً "نقش و نگار طاق نسیاں" بننا پڑا۔

جب تک ہمارے دلوں پر اپنے قدیم انشا پردازوں کی صحیح عظمت کے نقوش تا ثبت نہ ہو جائیں گے اور جب تک ہمارے دماغ اپنی زبان کے موجودہ شہ کاروں کی مخفی خوبیوں کو جلوہ گر کرنے میں کامیاب نہولیں گے اس وقت تک ہم میں اعلیٰ ادبی مذاق نہیں پیدا ہوگا اور اس وقت تک نہ ہماری قوم میں بہتر سے بہتر فن کار پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ ہماری زبان میں مہتم بالشان کارناموں کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔

سید محی الدین قادری زور
متعلم ایم اے جامعہ عثمانیہ

شاہ گنج حیدرآباد دکن
۴۔ محرم ۱۳۴۵ھ

میر کی مثنویاں

(۱)

میر تقی میر غزل گو شاعر تھے، اور آج تک کوئی بھی باوجود سخت کوششوں کے اس صنفِ سخن میں اُن کا کامل ہمسر نہ ہوسکا۔ ذوق اور ان کے ''یاروں'' سے نے (جن میں مرزا نوشہ بھی آجاتے ہیں) ''بہت زور غزل میں مارا'' لیکن ''میر کا انداز نصیب نہوا، پر نہوا''۔

خاقانی ہند کو یہ کیا معلوم تھا کہ آخر عمر میں مرزا غالب، میر کے انداز پر غالب آجائینگے! لیکن یہ فخر بھی صرف ''اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم'' کا نعرہ بلند کرنے والے ہی کی قسمت میں تھا، کسی اور کو کیونکر نصیب ہو؟

میر کی شاعری پر جسقدر لکھا جائے کم ہے، وہ زمانہ طوفانی رفتار اور سیلابی شورشوں کے ساتھ آرہا ہے۔ جب کہ مغربی تعلیم کے اثر سے اردو کے مردہ کارناموں میں بھی از سرِ جان ڈالی جائیگی اور جملہ خوابیدگیوں اور سرمستیوں کو، تنقیدی صداؤں کی گونج، بیداریوں اور ہوشیاریوں کی شکل میں منتقل کردیگی۔

جہاں میر کی غزل گوئی پر خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ ان کی مثنویوں پر بحثیں نہ کیجائیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی مثنویاں اعلیٰ پایہ کی

نہیں ہیں، ہم مانتے ہیں کہ ان میں ادبیت کا فقدان ہے، اور ہم اس سے بھی انکار نہیں کرتے کہ اردو کی بعض دیگر مثنویوں کے مقابلہ میں میر کی مثنویاں کچھ ناقص سی نظر آتی ہیں، لیکن ایک زبردست ادیب میں اتنی قدرت ضرور ہوتی ہے کہ وہ اپنے معمولی سے معمولی کارنامے کو بھی اپنے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رکھ لے۔

جب تک ملک الشعرا میر کی غزلیں زبان زد خاص و عام رہینگی، جب تک میر تقی کا نام زندہ جاوید ہستیوں کی فہرست میں چمکتا رہیگا اور جب تک اردو زبان نوع انسان کے ایک زبردست طبقہ کے خیالات کا ذریعہ اظہار بنی رہیگی۔ میر کی مثنویاں لوح ہستی سے ہرگز نہیں مٹ سکتیں۔

میر تقی مرزا غالب کی طرح ایک گوشہ نشین شاعر تھے۔ ان کی مشہور "بے دماغی" اور خودداری نے انھیں ماحول کی کیفیات اور بیرونی کائنات کے مطالعہ سے باز رکھا، برخلاف ان کے مرزا سودا، میر حسن اور میاں نظیر اکبرآبادی اپنے زمانے کی متفرق سوسائٹیوں میں شریک رہتے تھے اور اسطرح انہیں ہر بیرونی اور اندرونی چیز کی فطرت پر گہری نظر ڈالنے کا موقع حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ ان تینوں کے کلام میں ہستی اور اس کے متفرق پہلوؤں کے متعلق بہت زیادہ موقعے دستیاب ہوتے ہیں، خصوصاً نظیر اکبرآبادی کی نظر سوسائٹی اور ماحول کی ہر چیز پر حاوی تھی۔ ان کی آوارہ گردی اور بے قاعدہ مزاجی نے انھیں اس امر کا کافی موقع دیا تھا کہ وہ ہر قوم اور ہر طبقہ کے افراد سے دل کھول کر میل جول رکھیں اور اسی کے طفیل میں ان کے متعلق صحیح سے صحیح

اور بہتر سے بہتر تصویریں پیش کرسکیں۔ سودا۔ اور میرحسن۔ کے بیانات بھی شگفتہ مزاجی اور خوش باشی کے باعث میرتقی اور مرزا غالب کے بیانات سے زیادہ اصلی اور دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔

میر کو چونکہ زمانے نے بہت زیادہ گھریلو بنا دیا تھا اس لئے انھیں گھریلو اشیا کی فطرت کے مطالعہ کا تمام عمر موقع ملتا رہا۔ یہی سبب ہے کہ خانگی اشیا پر وہ بڑی شائستگی کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ذاتی حالات وخیالات نیز داخلی کیفیات نہایت قادر الکلامی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ پالتو جانور مثلاً مرغ، بلی، کتے، بندر، بکری، نیز برسات اور گھر کی درو دیوار پر انھوں نے جو مثنویاں لکھی ہیں، ان میں تفصیل کے ساتھ پتہ پتہ کی باتیں نہایت خوبی سے بیان کی ہیں۔

جب وہ نواب آصف الدولہ مرحوم کے ہمراہ دو تین دفعہ شکار کو گئے اور بیرونی کائنات کا مطالعہ کیا تو اس کی تصویریں بھی پیش کی ہیں جن میں سے بعض واقعی قابل تعریف ہیں، نیز ایک دو دفعہ سفر بھی پیش آیا تھا تو اس کے واقعات بھی قلمبند کرلئے ہیں اور یہ سب خارجی تصویریں کچھ بری نہیں ہیں۔ پس اگر زمانہ میر کو بیرونی کائنات کے مطالعہ کا اور زیادہ موقع دیتا تو بہت کچھ ممکن تھا کہ ان کی شاعری میں خارجی حالات کی بھی اچھی سے اچھی تصویریں نظر آتیں اور ان کی مثنویوں میں جہاں داخلی بیانات اور ذاتی حالات کی گہرائیوں کا فقدان نہیں۔ خارجی معاملات کی بلند پروازیاں بھی کثرت سے پائی جاتیں برخلاف دیگر مشرقی شعرا کے گو میر کی شخصیت اکثر ان کی غزلوں میں بھی نمایاں

نظر آتی ہے۔ لیکن اگر ان کی زندگی کے متعلق اور بہت کچھ معلومات حاصل کرنے ہوں تو آپ کو سب سے پہلے ان کی مثنویوں کی طرف رجوع کرنا پڑیگا۔

پر عظمت شخصیتوں کے حالات اور ان کی زندگی کے واقعات عام طور پر ان کی سوانح عمریوں سے معلوم کئے جاتے ہیں۔ لیکن خود مصنف کا قلم اس کی تصنیفات میں اس کا جو کامل مرقع کھینچتا ہے وہی حقیقی اور اصلی ہوتا ہے۔ دوسروں کے قلم صرف اس کے ظاہری خط و خال کا خاکہ کھینچ سکتے ہیں، لیکن قلب کی گہرائیوں میں جو رموز و اسرار مضمر ہیں ان کا دوسروں کو میسر آنا دشوار ہے۔ [1]

جب آپ میر کی مثنویوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ نہ صرف ان کی ذات غیر مضمر طور پر اس میں اپنی جھلکیاں دکھا رہی ہیں، بلکہ اُن کی معاشرتی ارتقا و ماحول کا عکس بھی اکثر جگہ اس میں پرتو فگن نظر آتا ہے۔ وہ آپ سے پکار پکار کر کہینگی کہ میر کی اخلاقی حالت اسدرجہ کی ہے، اِن کی فطرت کو بنانے اور معین کرنے میں ان اِن اثرات نے کام کیا ہے، اس قسم کی مضامین انھوں نے اپنی زندگی بسر کی، وہ لوگوں سے اسطرح گفتگو کرتے تھے، ان کے احساسات میں اسطرح ہمدردی اور تخیلات میں اسلئے نزاکت پیدا ہوگئی تھی۔ نیز کائنات اور اس کے مظہروں پر وہ اِن اِن طریقوں سے نظر ڈالا کرتے تھے گویا یہ مثنویاں ایک آئینہ ہے جس میں میر تقی میر مرحوم اپنی قلبی گہرائیوں اور نفسی کیفیتوں کے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

میر کی مثنویوں پر سب سے پہلے جس ادیب نے بوجوہ احسن قلم اٹھایا وہ آزاد تھے۔

[1] روح تنقید۔

گو انہوں نے اِن میں سے بعض کا مفصل ذکر کیا ہے لیکن وہ بھی ناکافی ہے۔ آزاد نے میر کی مثنویوں کے متعلق جو عام رائے ظاہر کی ہے وہ صرف اسقدر ہے کہ "مثنویاں مختلف بحروں میں ہیں، جو اصول مثنوی کے ہیں وہ میر صاحب کا قدرتی انداز واقع ہوا ہے۔ اس لئے بعض بعض لطف سے خالی نہیں"۔

آزاد کے علاوہ ان پر جس نقاد نے اور بھی روشنی ڈالی وہ حالی ہیں۔ حالی اپنے مقدمہ میں اردو شاعری کے ضمن میں مثنویوں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور مثنوی کے عام اصول بیان کرنے کے بعد اردو کے مثنوی نگاروں کا ذکر کرتے وقت سب سے پہلے میر تقی کی مثنویوں کے متعلق نہایت خوش مذاقی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں اور دراصل یہی خیالات وہ تخم ہیں جنکی بنا پر آئندہ کوئی شخص ان کے متعلق بہتر سے بہتر مضامین کے درخت پیدا کرسکتا ہے"۔

ان دو کتابوں (آبِ حیات اور مقدمہ شعر و شاعری) کے علاوہ متفرق تذکروں میں بھی میر کے حالات زندگی کے ضمن میں کبھی کبھی ان کی مثنویوں کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ لیکن وہ اکثر سطحی اور سرسری ہوتا ہے۔

چند سال قبل جب مولوی عبدالحق نے "انتخاب کلامِ میر" شایع کیا اور ان کی شاعری پر ایک چھوٹا سا مقدمہ بھی لکھا تو اُس میں ان کی مثنویوں کا بھی کچھ ذکر کردیا ہے۔

یہاں ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق جیسے محقق نے کسطرح یہ خیال قائم کرلیا کہ میر کی مثنویاں چودہ پندرہ سے زیادہ نہیں۔ حالانکہ ان کی ہر مطبوعہ کلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تیس[۳۰] سے زیادہ عنوانوں پر مثنویاں لکھیں جو ساڑھے تین ہزار سے

زیادہ ابیات پر مشتمل ہیں۔

مولوی حالی جو دکن کے ادیبوں اور ان کے کارناموں سے غالباً ناواقف تھے، میر تقی کو "غالباً" سب سے پہلا اردو مثنوی نگار خیال کرتے تھے۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ممکن ہے کہ میر کے سامنے دکن کی قدیم مثنویاں موجود ہوں اور انہوں نے ان گراں بہا خزانوں سے خوشہ چینی کی ہو۔ تاہم اگر اثر کی مثنوی پر بھی نظر نہ ڈالنا مناسب سمجھا جائے تو اسقدر کہا جا سکتا ہے کہ شمالی ہند میں مستقل مثنوی کو روشناس کرانے کا سہرا میر تقی ہی کے سر ہے۔

ہم اس امر میں سنجیدہ دماغ حالی کے ضرور ہم آہنگ ہونا چاہتے ہیں کہ میر کے زمانے میں اگرچہ غزل کی زبان بہت منجھ گئی تھی، مگر مثنوی کی زبان صاف ہونے تک ابھی بہت زمانہ درکار تھا، اسی لئے میر کی مثنویوں میں فارسی ترکیبیں، فارسی محاوروں کے ترجمے اور ایسے فارسی الفاظ جن کی اب اردو زبان متحمل نہیں ہوسکتی، اس انداز سے جو آج کل فصیح اردو کا معیار ہے، بلاشبہہ کسی قدر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نیز اردو زبان کے بہت سے الفاظ و محاورات جو اب تک متروک ہو گئے ہیں، میر کی مثنوی میں موجود ہیں"۔

غرض میر کا زمانہ غزل کی زبان تیار کر چکا تھا، مطالب و معانی کے لحاظ سے بھی غزل کے مضامین کے سانچے اسوقت بالکل موجود تھے، اس لئے کہ غزل کے مضامین صدیوں سے چلے آرہے تھے۔ اور اردو داں بھی ان کو کافی طور پر استعمال میں لا چکے تھے، لیکن مثنوی بالکل نئی چیز تھی، اس میں اور ہی قسم کی باتیں بیان کرنی پڑتی تھیں۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ ہوگی جو میر تقی مثنوی سے اکتا کر یا گھبرا کر جگہ جگہ غزل گوئی پر

اُڑاتے ہیں ۔ ان کی صید نامہ کی مثنویوں میں غزلیں کثرت سے ملتی ہیں ۔ چنانچہ ان میں چند بڑی بڑی غزلیں درج کر دی ہیں ۔ "کد خدائی نواب آصف الدولہ" کی مثنویوں میں غزل موجود ہے ، ہولی کی دونوں مثنویوں میں بھی غزلیں ہیں ۔ اس کے علاوہ دو تین مثنویوں میں قطعے اور رباعیاں بھی ہیں ۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں جیسا کہ پروفیسر آزاد نے لکھا ہے : "اس میں جو متفرق غزلیں جا بجا لگائی ہیں وہ عجب لطف دیتی ہیں"

اس حصہ مضمون کو ہم میر کی جملہ مثنویوں کی ایک فہرست پیش کرنے کے بعد ختم کرتے ہیں تاکہ آئندہ ہر جگہ ان کے ذکر کے ساتھ دیگر کیفیات لکھنے کی ضرورت نہ پڑے ۔ بلکہ صرف نام یا نمبر کی طرف اشارہ کرتے ہی تمام باتوں کی طرف ذہن آسانی سے منتقل ہو سکے :-

نمبر شمار	نام	بحر	تعداد اشعار	[illegible]	کیفیت
۱	شعلۂ عشق	متقارب (فعولن فعولن فعولن فعول)	۲۲۴	لکھنو	•
۲	دریائے عشق	خفیف (فاعلاتن مفاعلن فعلن)	۲۶۶	″	•
۳	صید نامہ (۱)	متقارب (فعولن فعولن فعولن فعول)		″	غزلیں بھی ہیں
۴	صید نامہ (۲)	″ ″		″	″
۵	صید نامہ (۳)	″ ″	۲۲۶	″	″
۶	کد خدائی نواب	خفیف (فاعلاتن مفاعلن فعلن)	۶۳	″	ایک غزل بھی ہے
۷	مرغبازان	″ ″ ″	۵۴	″	•

۸	دنیا	متقارب (فعولن فعولن فعولن فعول)	۵۰	لکھنو	۰
۹	ہولی	رمل (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن)	۴۶	؍؍	ایک غزل بھی ہے
۱۰	بکری	؍؍ ؍؍ ؍؍	۲۷	؍؍	۰
۱۱	افغان پسر	متقارب (فعولن فعولن فعولن فعول)	۱۶۳	؟	۰
۱۲	ساقی نامہ ہولی	خفیف (فاعلاتن مفاعلن فعلن)	۱۱۸	لکھنو	ایک غزل بھی ہے
۱۳	جھوٹ	مضارع (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن)	۲۰	؍؍	۰
۱۴	سفر برسات	خفیف (فاعلاتن مفاعلن فعلن)	۲۱۸	دہلی	۰
۱۵	مثنوابوزینہ	رمل (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن)	۳۳	؍؍	۰
۱۶	موہنی بلی	؍؍ ؍؍ ؍؍	۷۸	؍؍	۰
۱۷	اپنے گھر کا حال	خفیف (فاعلاتن مفاعلن فعلن)	۱۲۰	؍؍	۰
۱۸	معاملات عشق	خفیف (؍؍ ؍؍ ؍؍)	۲۳۹	دہلی	۰
۱۹	اژدر نامہ	متقارب (فعولن فعولن فعولن فعول)	۵۸	؍؍	۰
۲۰	تنبیہ الجہال	رمل (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن)	۷۲	؍؍	۰
۲۱	مذمت آئینہ دار	؍؍ ؍؍	۴۶	؍؍	۰
۲۲	در ہجو نا اہل	؍؍ ؍؍	۱۰۷	؍؍	۰
۲۳	ہجو عاقل	مضارع (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن)	۳۷	؍؍	۰
۲۴	ہجو خانہ خود	خفیف (فاعلاتن مفاعلن فعلن)	۴۹	؍؍	۰

۲۵	تعریف سگ و گربہ	خفیف (فاعلاتن مفاعلن فعلن)	۳۲	دہلی	ایک قطعہ بھی ہے
۲۶	تعریف دہ ہاسگ	" " "	۱۲	"	۔
۲۷	مذمت بز شگال	" " "	۴۵	"	۔
۲۸	ہجو اکول	" " "	۴۲	؟	۔
۲۹	مرثیہ خروس	مجتث (مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن)	۲۴	لکھنو	۔
۳۰	تعریف آغا رشید	خفیف (فاعلاتن مفاعلن فعلن)	۱۷	دہلی	۔
۳۱	ساقی نامہ	ہزج (مفعول مفاعلن فعولن)	۱۰۰	لکھنو	۔
۳۲	جوش عشق	متقارب (فعلن فعلن فعلن فعلن)	۱۵۶	"	۔
۳۳	اعجاز عشق	" (فعولن فعولن فعولن فعول)	۲۷۹	دہلی	۔
۳۴	خواب و خیال	" " "	۱۲۹	"	۔

اس فہرست کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً نصف کے قریب مثنویاں دہلی میں لکھی گئی تھیں اور باقی کی نصف لکھنو میں، نیز یہ کہ دس مثنویاں بحر متقارب میں، تیرہ بحر خفیف میں، اور سات بحر رمل میں لکھی گئی ہیں، ان کے علاوہ دو مضارع میں، ایک مجتث میں اور ایک ہزج میں بھی، یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ میر نے اس بحر میں مثنویاں لکھیں جو عام طور پر مثنوی کے لئے مروج نہ تھی۔

(۲)

مثنویات میر کی جو فہرست ہم نے پیش کی ہے اس میں ہر مثنوی کے آگے لکھنو یا دہلی لکھا ہوا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اکثر مثنویوں کے متعلق قطعی طور پر فیصلہ کر دیا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں لکھی گئی تھیں لیکن بعض مثنویاں ایسی ہیں جنپر صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے کہ وہ یا دہلی میں لکھی گئی ہیں یا لکھنو میں۔ یہاں ہمنے ان قیاسی اور تحقیقی دونوں اسباب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جن کی بنا پر ہم ایک مثنوی کو لکھنو کی اور ایک کو دلی کی کہتے ہیں۔

پہلی مثنوی غالباً لکھنو ہی میں لکھی گئی ہے، کیونکہ اس میں پٹنہ کا واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے جسکو میر تقی نے غالباً لکھنو ہی میں سنا ہوگا۔ اور ایک دلیل جس کی بنا ر پر اس کو لکھنو کی پیداوار کہا جا سکتا ہے یہ ہے کہ اس میں جس نوجوان کا ذکر کیا گیا ہے وہ بالکل ایک لکھنوی نوجوان معلوم ہوتا ہے، نوجوانوں کا عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار کرنا اور انپر لوگوں کا عاشق ہونا غالباً لکھنو میں زیادہ رائج تھا کیونکہ ایران کا جتنا اثر لکھنو پر پڑا دہلی پر ہرگز نہیں پڑا، دہلی میں سنی مسلمانوں کی حکومت ہونے کی وجہ سے ایرانیوں کی زیادہ آؤ بھگت نہیں ہوتی تھی برخلاف اس کے لکھنو کا دربار اور وہاں کے در و دیوار ایرانیوں کو خوشامدید کہنے کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے، میر نے بھی اپنی ایک مثنوی میں ایران سے آئے ہوئے لوگوں کے روٹھنے اور ان کی ناز برداری کیطرف

اشارہ کیا ہے۔

دوسری مثنوی بھی متذکرۂ بالا وجہ سے لکھنو کی پیداوار کہی جا سکتی ہے۔ اور ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ میر نے جتنی بڑی اور پلاٹ (ڈھانچ) والی مثنویاں لکھی ہونگی وہ غالباً آخر عمر ہی میں لکھی ہوں گی۔

تیسری، چوتھی اور پانچویں مثنویاں جو نواب آصف الدولہ کے شکار سے متعلق ہیں یقیناً لکھنو کی ہیں۔ چھٹی مثنوی کدخدائی نواب آصف الدولہ بھی لکھنو ہی کی ہے۔
ساتویں مثنوی کے شروع ہی کا شعر مظہر ہے کہ وہ لکھنو میں لکھی گئی ہے۔

دلی سے ہم جو لکھنو آئے ؛ گرم پرخاش مرغ یاں پائے

آٹھویں مثنوی میں میر نے اپنی زندگی کے آخری ایام کا نقشہ اتارا ہے لہذا وہ لکھنو ہی میں لکھی گئی ہوگی۔

نویں مثنوی نواب آصف الدولہ کے ہولی کھیلنے پر لکھنو ہی میں لکھی گئی ہے۔

دسویں مثنوی بھی لکھنو میں لکھی گئی تھی۔ کیونکہ مثنوی کے اختتام کے قریب کہتے ہیں۔ ع لکھنو سے غل ہے تا بکری کی جھیل۔

گیارہویں مثنوی کے متعلق ہم کوئی قطعی فیصلہ نہیں پیش کر سکتے۔ لیکن جن وجوہ سے مثنوی نمبر (٢) کو لکھنو کی قرار دیا گیا ہے اسکو بھی لکھنو ہی کی پیداوار کہہ سکتے ہیں۔

بارہویں مثنوی لکھنو میں لکھی گئی ہے۔ اس میں ایک جگہ کہتے ہیں

منعقد مجلس شبانہ ہے ؛ ادب آصف زمانہ ہے

تیرہویں مثنوی کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تاہم چونکہ اس میں ایک دو جگہ "شہ" کا ذکر ہے اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ دہلی میں لکھی گئی ہوگی۔ کیونکہ لکھنو والے "والی اودھ" کو نواب وزیر یا وزیر کہتے تھے اور خود میر نے بھی اپنی مثنویوں میں جا بجا "دستور" "وزیر" وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اور ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ دہلی کے دفاتر کی حالت منتظم اور زبردست حاکم نہ ہونے کی وجہ سے بہ نسبت لکھنو کے محکموں کے زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ پس اس میں جس دفتری کا ذکر ہوگا وہ دہلی ہی کا ہوگا۔ اور یہ مثنوی دہلی ہی کے دردانگیز صداؤں میں سے ایک ہے۔

چودھویں مثنوی میں چونکہ دہلی کے اطراف و نواح کا سفر پیش کیا گیا ہے، نیز یہ کہ اس میں ایک جگہ شاہ عالم کا ذکر ہے۔ پس ممکن ہے کہ وہ دہلی ہی کے احباب کی فرمائش پر لکھی گئی ہو۔

پندرہویں اور سولہویں مثنویاں غالباً دہلی کی ہیں، اسلئے کہ اول الذکر میں چوک (جو غالباً چاندنی چوک ہوگا) اور موخر الذکر میں بلی ماروں کے محلہ کا ذکر ہے نیز یہ کہ بعض اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شباب کا کلام ہے۔

سترہویں مثنوی غالباً دہلی کی ہے کیونکہ اس میں دہلی کے مکان کی خراب و خستہ حالت پر مرثیہ لکھا گیا ہے۔

اٹھارہویں مثنوی جوانی کا کلام معلوم ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ دہلی میں لکھی گئی ہو۔
اُنیس، بیس، اکیس، اور بائیس نمبروں کی مثنویاں دہلی ہی کی ہیں ایک جگہ

صاف لکھتے ہیں کہ جب میں یہاں شہر دہلی میں آیا تو شعر وسخن کا چرچا بہت کم ہو گیا تھا۔

تیئیسویں مثنوی ایک دہلی ہی کے شخص کی ہجو میں لکھی ہے۔ پس وہ دہلی ہی میں لکھی گئی ہوگی کہتے ہیں ؎

دلی میں ہیں کتیاں کھیں سے لیکے پالیاں ؛ ہمسایوں کی جنھوں کے لئے کھائیں گالیاں

چوبیسویں مثنوی اپنے گھر کی خرابی پر لکھی ہے۔ غالباً دہلی کی ہے۔

پچیس چھبیس اور ستائیس نمبر کی مثنویاں دہلی ہی کی ہونگی کیونکہ جانور پالنے کے متعلق پندرھویں اور سولھویں مثنویوں میں دہلی کے طرف اشارہ ہے۔ اور ستائیسویں مثنوی کو بیسویں مثنوی کی طرح دہلی ہی کی کہہ سکتے ہیں۔

اٹھائیسویں مثنوی پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

انتیسویں[29] مثنوی پر قطعی فیصلہ تو نہیں کر سکتے مگر اسقدر کہہ سکتے ہیں کہ مرغوں کا زیادہ شوق چونکہ لکھنؤ میں تھا۔ پس ممکن ہے کہ یہ مثنوی بھی لکھنؤ ہی کی ہو۔

تیئیسویں مثنوی ایک دہلی کے مشہور خوشنویس آغا رشید کی تعریف میں ہے اور غالباً دہلی میں لکھی گئی ہے۔

اکتیس اور بتیس نمبر کی مثنویاں شاید لکھنؤ کی ہوں کیوں کہ ایک میں بہار اور خوشی کا سماں دکھایا ہے۔ اور موخر الذکر مثنوی نمبر ۲ کی وجہ پر لکھنؤ کی کہہ سکتے ہیں لیکن اسکے متعلق یقین نہیں۔

تینتیسویں مثنوی دہلی کی ہوگی اس لئے کہ اگر لکھنؤ میں لکھی جاتی تو تیر نواب کا ذکر

ضرور کرتے۔ اور یہ مثنوی اریجنل نہیں معلوم ہوتی بلکہ شاید کسی فارسی کا ترجمہ ہے۔ اس وجہ سے مثنوی کے شروع میں انھوں نے متفرق عنوان کے ماتحت کچھ کچھ اشعار لکھے ہیں اگر لکھنؤ میں لکھتے تو غالباً کچھ اور عنصر زیادہ کرتے۔

چونتیسویں مثنوی دہلی کی ہے۔ آگرہ سے نکلنے اور دہلی پہونچنے کے بعد جو اقعات ہوئے ان کو بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی ⁂ در و بام پر چشم حسرت پڑی
پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت ⁂ بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت



(۳)

میر کی مثنویاں

"میر کی مثنویوں میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے، انہوں نے چند صحیح یا صحیح واقعات بطور حکایات کے سیدھے سادے طور پر بیان کر دئے ہیں .... مگر جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے برخلاف بیشرمی اور بے حیائی کی باتوں سے مبّرا ہیں"۔ (حالی۔ مقدمہ شعر و شاعری)

"مثنویات میر تقی کی معنوی خصوصیات کے متعلق یہ وہ اٹل رائے ہے جس کی مخالفت کوئی شخص کسی زمانے میں نہیں کر سکتا۔

معنوی خصوصیات کے لحاظ سے میر کی مثنویاں تین قسم کی ہیں، ایک وہ جو عشق و محبت کے متعلق لکھی گئی ہیں، دوسری وہ جو نواب آصف الدولہ مرحوم سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہیں اور تیسری وہ جن میں سے اکثر میر تقی میر کی خانگی زندگی اور ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلی دو قسم کی مثنویاں کچھ طویل ہیں اور ان میں سے اکثروں میں پلاٹ بھی پایا جاتا ہے تیسری قسم کی مثنویوں میں گو پلاٹ نہیں مگر میر کے ذاتی حالات اور خیالات سے بہت زیادہ متعلق ہونے کے سبب دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔

میر کی جو مثنویاں خاص طور پر عشقیہ کہلائی جا سکتی ہیں وہ یہ ہیں

(۱) شعلہ عشق (۲) دریائے عشق (۳) معاملات عشق (۴) جوش عشق۔
(۵) اعجاز عشق (۶) عشق افغان پسر۔

اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ شاعری کا وجود کس چیز پر قائم ہے تو ہمیں بلا تامل اس نتیجہ تک پہونچنا پڑیگا کہ شعر و شاعری کا وجود انہی تخیلات اور جذبات کا مرہون منت ہے جنکی روشنی میں انسان کائنات کا اور اُس کائنات کا مطالعہ کرتا ہے جس کا وہ خود ایک جزو ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ واقعات اور کارنامے بھی جنکو وہ سرانجام کرتا ہے یا جن کے لئے اس نے کوئی تکلیف اٹھائی ہے، شاعری کی تخلیق کے باعث ہوتے ہیں، اسی وجہ سے رزمیہ نگاری کا ادبیات میں بہت بڑا درجہ ہے، رزمیہ نگار کا دائرہ عمل بہت وسیع ہوتا ہے۔ کوئی رزمیہ نگار صرف ایک ہی قسم کے جذبہ یا خیال کو ہمارے سامنے نہیں پیش کر دیتا بلکہ ہمیں زندگی کے تمام نمایاں پہلوؤں سے بھی روشناس کرا دیتا ہے۔ اس کے برخلاف عاشقانہ شاعری کی امتیازی خصوصیت اس کا داخلی ہونا ہے۔ وہ اُن انفرادی نقوش تاثر کا اظہار کرتی ہے جو خارجی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس کا دامن کسی قابل یادگار واقعہ، کسی زبردست جذبہ، یا کسی حکیمہ خیال سے ہمیشہ وابستہ رہتا ہے۔ اس لئے اس قسم کی شاعری یکساں، پر جوش نقائص سے آزاد اور مکمل ہوتی ہے۔ اور یہی شاعری تمام اصناف سخن میں زیادہ دلکش اور دلفریب معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ تمام اقوام عالم کی عشقیہ شاعری میں ایک قریبی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور کیوں نہ پائی جائے جب کہ انسانی جذبات عشق کے اظہار میں تمام قومیں

ایک ہیں ؟

مشرق اور مغرب کا کوئی شاعر ایسا نہ ہوگا۔جس کے کلام میں محبت کے متعلق خیالات کی فراوانی نہ پائی جاتی ہو۔ خصوصاً ایشیا میں اس جذبہ کی ترجمانی کے لئے بیحد وقت صرف کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ، محبت تمام انسانی جذبات سے زیادہ قیمتی اور قابل ستائش جذبہ ہے اور ہر آدمی از مہد تا لحد اسی کا آرزومند، اسی کا شیدائی اور اسی کا متمنی رہتا ہے لیکن اعتدال بھی تو کوئی چیز ہے! ایرانیوں نے اپنے تخیل کو صرف اسی جذبہ کے اسقدر پیچھے لگا دیا کہ وہ اپنی تمام حقیقتوں کو وقف عدم کرکے عنقا صفت بنگیا۔ نیز پریم اور الفت کی تمام گہرائیاں تصنع اور تکلف کی شکل میں منتقل ہو گئی۔ اور اب یہاں تک نوبت پہونچی ہے کہ ہماری ذہنیات عشق عاشقی کی باتوں سے متنفر ہونے لگی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ۔

هر کرا جامه ز عشقے چاک شد　　او ز حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما　　اے تو افلاطون و جالینوس ما
جسم خاک از عشق بر افلاک شد　　کوہ در رقص آمد و چالاک شد

کہنا باعث شرف و معراج کمال تھا اور اب یہ حال ہے کہ عشق کے متعلق شعر کہنا مذموم ٹھہرایا گیا ہے آج کل کے روشن دماغ عشقیہ مضامین پڑھنا یا لکھنا بیوقوفی قرار دیتے ہیں کئی برس قبل ہی مقدمہ شعر و شاعری کے مصنف اور موجودہ طرز شاعری کے بانی نے عشق سے

مخاطب ہو کر علی الاعلان کہدیا کہ ؎

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا ؛ جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

مولانا حالی نے عشقیہ شاعری کی کثرت رواج کے اسباب اور استیصال کی تدابیر کے متعلق اپنے دیوان کے مقدمہ اور دیباچہ میں کافی بحث کی ہے، لیکن یہاں کم از کم اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میر تقی جس زمانہ میں پیدا کئے گئے تھے، ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے جنت نشاں بن چکا تھا، عیش و طرب کی محفلیں گرم ہو ہو کر سرد ہوتی جا رہی تھیں اور دولت و عظمت کے صدیوں کے جمع کئے ہوئے خزانے فیاضی سے لٹائے جا رہے تھے۔ ایسے ماحول میں ضروری تھا کہ عشق و محبت کے دلولے اپنی پوری طاقتوں کے ساتھ موجزن ہونے لگیں۔

قوموں کی ترقی کد و کاوش، بردباری اور سخت جاں کاہیوں کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن جہاں اُن کی ترقیاں معراج کمال پر پہونچ جاتی ہیں، جہاں اقبال کا نیّر رخشاں، ان کے سروں پر پورے جلال کے ساتھ ضیا پاشیاں کرنے لگتا ہے، جہاں حکومت و ثروت اور عزت و دولت ان کے آگے لونڈی غلاموں کی طرح اطاعت کیشی کرنے لگتے ہیں، ان کے عیش و عشرت کے جذبات میں بھی طغیانی پیدا ہوتی ہے، بہادری اور خودداری، عاشق مزاجیوں اور سرمستیوں کے دامن میں پناہ لیتی ہے تمام قومی گرمجوشیاں، انفرادی سرد مہریوں کی شکل میں منتقل ہونے لگتی ہیں اور حسن و محبت کی قیامت خیز اشتگین رہ رہ کے دلمیں چٹکیاں لینی شروع کر دیتی ہیں۔

میر کے خیال کے موافق اس میں کوئی شک نہیں کہ "محبت سے کچھ سب زمانے میں ہے۔
لیکن جیسا کہ ہم ابھی اوپر کہہ آئے ہیں اگر اس کا بجا طور پر اور مناسب استعمال کیا جائے ورنہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادبار کی کالی کالی گھٹائیں، بلاؤں کی ڈراؤنی صورتوں میں نازل ہونے لگتی ہیں اور اسلاف کی صدیوں کی جمع کی ہوئی نعمتیں، اخلاف کی چند ہی شبستانوں میں ہوا کی طرح اڑ جاتی ہیں۔

میر تقی کی نشو و نما جس ماحول میں ہوئی اور وہ اُس سے جسقدر متاثر ہوئے اس کی مفصل حالت (انہی کی مثنویوں سے اخذ کرکے) آئندہ صفحات کہیں آپ کو معلوم ہو جائیگی۔ لیکن یہاں اس امر کا اظہار ضروری تھا کہ ان کی درد مند طبیعت کی فطری افتاد کے علاوہ اس امر میں ان کے ماحول کا بھی اثر تھا جو انھوں نے عشق کی کیفیات کو دل کھول کر بیان کیا ہے۔

میر تقی کی جملہ عشقیہ مثنویوں میں سب سے پہلے شعلۂ عشق ہے جس کا پورا ڈھانچ عشق ہی سے متعلق ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر اس کی ابتدا کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور ۔۔۔ نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب، محبت سبب ۔۔۔ محبت سے آتے ہیں کارِ عجب
محبت ہی اس کارخانے میں ہے ۔۔۔ محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبت لگاتی ہے پانی میں آگ ۔۔۔ محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ
محبت سے ہے انتظامِ جہاں ۔۔۔ محبت سے گردش میں ہے آسماں

محبت سے آتا ہے جو کچھ کہو ٭ محبت سے ہو جو، وہ ہرگز نہو
نئے اسکے چرچے حکایت سنی ٭ گہے شکر، گاہے شکایت سُنی
کوئی شہر ایسا نہ دیکھا کہ واں ٭ نہو اس سے آشوب محشر عیاں

غرض محبت پر تیس شعر لکھنے کے بعد اپنے بیانات کے ثبوت میں ایک قصہ سنایا جاتا ہے کہ پٹنہ میں ایک نوجوان پرسرام نام نہایت حسین اور رنگین مزاج ہے اس زمانے کے عام مذاق کے موافق لوگ اس کے حسن ورعنائی پر جان دیا کرتے ہیں اور ایک شخص اس کا سخت عاشق بھی ہے جسکے ساتھ وہ اکثر رہا کرتا ہے۔ لیکن جب پرسرام کی شادی ہوتی ہے تو وہ چند دنوں کے لئے اپنے عاشق کے پاس آنا جانا چھوڑ دیتا ہے اور یہ بات عاشق کو بری معلوم ہوتی ہے۔

جب ایک مدت گذر جاتی ہے اور پرسرام کو اپنے قدیم دوست کا خیال آتا ہے تو وہ اس سے ملنے کے لئے پہونچتا ہے۔ اب عاشق مزاج دوست اس سے گلہ شکوہ کرتا ہے کہ اے نازنیں! کیا وجہ تھی کہ تو اتنے دن تک مجھ سے غافل رہا۔؟ اور یہ کس کی آنکھ نے تجھ پر جادو کیا کہ میری عشرت کا پیالہ خون سے پُر ہو گیا؟ اسپر پرسرام جواب دیتا ہے کہ میری شادی ہو گئی تھی اور اتفاق سے مجھے بہت محبت کرنیوالی بیوی ملی ہے۔ لھذا تو اب مجھے معذور جان کہ میں ناچار ہوں اور اپنی بیوی کی محبت میں گرفتار۔

اس کا دوست اس کے زمانے کے عام مذاق کے موافق عورتوں کی مذمت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عورتیں بڑی مکار ہوتی ہیں، قرآن پاک میں بھی ان کے کر کا ذکر

کیا گیا ہے، وہ ناقص العقل ہوتی ہیں اور کبھی کسی سے وفا نہیں کرتیں، عورت ظاہر میں لاکھ رشکِ ماہ کیوں نہو لیکن باطن میں مارِ سیاہ ہوتی ہے، میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ساری دنیا میں عورتوں کا فریب مشہور ہے۔ اور اگر اسپر بھی تمھیں یقین نہیں آتا تو میں اس کا تجربہ کرکے دکھاتا ہوں۔

غرض ایک شخص بلایا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ پرسرام کی بیوی کو یہ خبر دی آؤ کہ پرسرام دریا میں ڈوب کر مرگیا، چنانچہ وہ شخص جاتا ہے اور اس کی بیوی سے یہ فرضی ماجرا کہہ سناتا ہے اس محبت کی ماری پر اس واقعہ سے جو کچھ اثر ہوا۔ وہ درد انگیز ہے، اسنے دروازہ کیطرف ایک بار دیکھا اور اس کے بعد آہ سرد بھر کر جاں بحق ہوگئی اور اس کی لاش کو دریا کے کنارے جلا دیا گیا۔

جب اس واقعے کی خبر پرسرام اور اس کے دوست تک پھونچائی جاتی ہے تو پرسرام کے ہوش اڑ جاتے ہیں اس کا نافہم عاشق حیران رہجاتا ہے اور اپنے سر کو گریباں میں چھپا لیتا ہے۔

اب پرسرام کی حالت قابل دید ہے، اس کی بیقراری اور اضطراب میں ترقی ہونے لگی اور جب رفتہ رفتہ وحشت زیادہ ہوتی گئی تو اس کو نیک و بد کی بھی تمیز باقی نہ رہی وہ تنہا کبھی صحرا کی طرف اور کبھی دریا کے کنارے نکل جانے لگا۔

اتفاقاً ایک روز شام دریا کی طرف گیا اور جب رات ہوگئی تو " وہاں سے آیا نہ گیا " وہیں قریب میں کہیں ایک ماہی گیر رہتا تھا، پرسرام نے اس کے پڑوس میں رات بسر کرنے کی ٹھانی، جب رات کچھ زیادہ گذری تو سنتا کیا ہے کہ ماہی گیر کی بیوی اپنے شوہر سے کہتی ہے

کہ تم سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ تم اب ہماری فکر نہیں کرتے ہو، کیا بات ہے کہ تم آج کل شب میں کہیں جال ڈالنے نہیں جاتے اور اسی وجہ سے ہمیں تنگی میں گذارنا پڑتا ہے ماہی گیر جواب میں ایک واقعہ سناتا ہے کہ کسطرح ہر شب ایک شعلہ آسمان سے نکلتا ہے اور دریا پر آکر تڑپنے لگتا ہے اور آواز دیتا ہے کہ اے پرسرام تو کہاں ہے، میں تیری مفارقت میں آتش بجاں ہوں۔ غرض ماہی گیر کہتا ہے کہ اسی واقعہ کے سبب میں نے دریا پر جانا چھوڑ دیا ہے۔

ماہی گیر کی زبان سے اپنے متعلق کچھ سننے کے بعد پرسرام نے اس شعلہ سے جا ملنے کی ٹھانی چنانچہ ایک روز مکان پہونچ، اپنے چند ساتھیوں کو لئے ماہی گیر کی رہبری میں، عین اُسی وقت جبکہ شعلہ آسمان سے اترا کرتا تھا پرسرام دریا پر کشتی میں بیٹھکر نکلا۔ اور اس مقام پر جہاں شعلے آکر تڑپا کرتا تھا پہنچنے ہی پائے تھے کہ وہی شعلہ اترا اور پرسرام اسکو دیکھتے ہی دریا میں کود پڑا۔ اور اس شعلہ میں غائب ہوگیا۔ اس کے تمام ساتھی سخت پریشانی کے ساتھ دریا سے واپس آئے۔ یہاں میر تقی ''مقولہ شاعر'' کے ماتحت پھر اصل بحث کی طرف عود کرتے ہیں کہ۔

اگر ہے یہ قصہ بھی حیرت فزا — دلے میر یہ عشق ہے بد بلا
بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے — بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے
فسانوں سے اس کے لبالب ہے دہر — جلائے ہیں اس تند آتش نے شہر
محبت نہو کاش مخلوق کو! — نچھوڑے یہ عاشق نہ معشوق کو

دوسری مثنوی ''دریائے عشق'' بھی عشق ہی کے بیان سے شروع ہوتی ہے چنانچہ

فرماتے ہیں :-

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال ہر جگہہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جاکر کبھی تو درد ہوا کہیں سینے میں آہِ سرد ہوا
کبھی آنکھوں سے خون ہو کے بہا کبھی سر میں جنون ہو کے رہا
کبھی رونا ہوا ندامت کا کبھی ہنسنا ہوا جراحت کا
گہہ نمک اسکو داغ کا پایا کبھی موجب شکستہ رنگی کا

غرض یہاں بھی پہلی مثنوی کی طرح عشق کے متعلق بتیس شعر کہکر ایک " جوان رعنا" کے عشق کا قصہ بیان کیا جاتا ہے جو باوجودیکہ خود بھی خوبصورت تھا۔لیکن عشق عاشقی میں سرمست رہا کرتا تھا اور اپنی اس حسن پرستی کے باعث ہمیشہ پریشان رہتا تھا، ایک دفعہ ایک گلی میں سے گذر رہا تھا کہ ایک نوجوان عورت ایک کھڑکی میں دکھائی دی۔ پھر کیا تھا :-

ہوش جاتا رہا نگاہ کیساتھ صبر رخصت ہوا اک آہ کیساتھ

ایک طویل داستان کے بعد جب عاشق و معشوق دونوں کو دریا میں غرق کر کے وصل سے مستغنی کیا جاتا ہے تو یہاں بھی پھر " مقولۂ شاعر" آتا ہے کہ

میر اب شاعری کو کر موقوف عشق ہے ایک فتنۂ معروف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے اُسے جو تو کہے سو آتا ہے
کتنی وسعت ترے بیاں میں ہے کتنی طاقت تری زباں میں ہے

لب پہ اب مہر خامشی بہتر   یاں سخن کی فراموشی بہتر

اس کے بعد اور ایک مثنوی آتی ہے جس میں ایک افغان نوجوان کا ایک ہندو عورت کے ساتھ محبت کرنا دکھلایا گیا ہے۔ اس مثنوی کے آغاز میں خدائے تعالیٰ سے دعا کی گئی ہے کہ اے الٰہی زبان دے مجھے معذرت دار کہ تاکہ میں عشق کی کیفیتیں بیان کرنے میں تر زبان رہوں۔ چنانچہ اس کے بعد لکھتے ہیں:-

عجب عشق ہے مرد کار آمدہ   جہاں دونوں اسکے ہیں ہم زدہ

اس سلسلہ کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں:-

جواں کیسے کیسے موئے عشق میں!   بہت گھر خرابی ہوئی عشق میں
بہت جان ناکام دینے گئے   تمنائے دل ساتھ لیتے گئے
محبت ہے نیرنگ ساز عجیب   فسانے ہیں اس کے عجیب و غریب
غرض عشق ہے طرفہ نیرنگ ساز   کہیں ناز یکسر، کہیں ہے نیاز

تقریباً پچاس شعر عشق کی تعریف میں کہنے کے بعد گجرات کے افغان پسر کا قصہ شروع کیا جاتا ہے۔ جو خوش اندام وخوش رو ہونے کے علاوہ نیک اور پاکیزہ خو بھی تھا۔ باوجود اپنی حیاداری اور زاہد مزاجی کے ایک عورت سے اتفاقاً اس کی شرگیں نظریں جا لڑیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ:-

یہ دل مستقل ناشکیبا ہوا   دل طرف ثانی بھی بیجا ہوا

لیکن شرم و حیا حائل تھی۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ وہ عورت اسی رستہ سے پانی لانے

کے لئے اکثر آنے جانے لگی اور مدتوں یہ دیکھا دیکھی رہی"، یہاں میر صاحب نے دونوں کے عشقی جذبات کی ایک تفصیل وار تصویر کھینچی ہے ۔

آخر کار اس عورت کا خاوند سخت بیمار ہوکر مرجاتا ہے اور اس عورت کو بھی اس کے ساتھ جلنا پڑتا ہے۔ یہ دیکھ کر افغان عاشق سے رہا نہیں جاتا اور وہ بھی آگ میں کود پڑتا ہے، لیکن اس کے ساتھی اسکو ادھ جلا نکال لیجاتے ہیں۔ نوجوان دن بھر بیتاب رہتا ہے اور شام کے وقت دیکھتا ہے کہ :۔

خراماں چلی آتی ہے وہ پری　　وہی ناز و عشوہ وہی دلبری
وہی صورت اسُ کی ہے جلوہ نما　　وہی رنگ رو گل کی غیرت فزا
اسی طرز و انداز خوبی کیساتھ　　اٹھایا اُسے ہاتھ میں لیکے ہاتھ

اسطرح اپنے ساتھ لیکر غائب ہوگئی۔ یہاں قصہ کی صورت فوق العادت ہوگئی ہے لیکن وہ اسقدر صاف ہے کہ بہت آسانی سے اس کی توجیہ ہوسکتی ہے ۔

اس قصہ کو میر صاحب عشق کے بیان پر ختم کرتے ہیں اور کہتے ہیں :۔

نہ کر میر اب عشق کی گفتگو　　قلم اور کاغذ کو رکھ دے بھی تو
فسانے ہیں اس کے ہزاروں ہزار　　یہی کشت و خوں کا ہے یہ گرم کار
بہت خاک جل جل کے یاں ہو گئے　　رہ عشق میں جی بہت کھو گئے
غرض ایک ہے عشق بے خوف و باک　　کیئے دونوں معشوق و عاشق ہلاک

کلیات میں ایک اور مثنوی "معاملات عشق" کے نام سے ملتی ہے، یہ مثنوی بہت بڑی ہے اور میر کی آپ بیتی ہے۔ اسکو انہوں نے کئی ذیلی عنوانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کی زبان بہ نسبت دیگر مثنویوں کے زیادہ شستہ ہے، اور عشق کے متعلق اس میں نہایت وضاحت کے ساتھ شعر لکھے گئے ہیں کیونکہ وہ ان کے ذاتی حالات اور خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق؟ — حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ — عشق بن تم کہو، کہیں ہے کچھ!
عشق حق ہے کہیں، نبی ہے کہیں — ہے محمد کہیں، علی ہے کہیں
عشق عالیجناب رکھتا ہے — جبرئیل و کتاب رکھتا ہے
عشق میں لوگ زہر کھاتے ہیں — عشق سے رنگ سبز لاتے ہیں
عشق میں رنگ زرد ہوتا ہے — عشق سے دل میں درد ہوتا ہے
عشق لایا ہے آفتیں کیا کیا! — اس سے آئیں قیامتیں کیا کیا!!
شان ارفع ہے جنکی، خوار ہیں یاں — عقل والے، جنوں شعار ہیں یاں
خستہ عشق کچھ نہ میر ہوے — بادشاہ عشق میں فقیر ہوے
کوئی باتیں کرے ہے شوق کے ساتھ — کوئی چپکا ہوا ہے ذوق کے ساتھ
ایک محو لباس عریانی — ایک سرگرم دامن افشانی

غرض اس قسم کے سینتالیس (۴۷) شعر لکھنے کے بعد "معاملہ اول" شروع کیا جاتا ہے اور ایسے

کل سات معاملے ہیں جو ایک سو بیانوے [192] اشعار پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔

ان معاملات میں میر نے "ایک صاحب" کے ساتھ اپنے تعلقات بیان کئے ہیں اور بعض جگہ اس حد تک بے تکلف اور شگفتہ ہو گئے ہیں کہ اپنی مشہور خودداری سے ہاتھ دھو بیٹھے اس مثنوی میں وہ اکثر جگہ رندانہ نعرے لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مثنویات کے سلسلہ کے آخر میں ایک مشہور مثنوی "اعجاز عشق" آتی ہے جو غالباً فارسی مثنویوں کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ اس میں "ثنائے جہاں آفریں" (دس [10] شعر) "در توحید انشا از خزینے کہ فقرۂ ملیات اور در عالم دو دیدہ (بارہ شعر)" در نعت سید المرسلین" (تیرہ [13] شعر) اور "مناجات بطور عاشقاں زار و در بلائے جدائی گرفتار" (بیس [20] شعر) کے عنوانات قائم کئے ہیں اور اسکے بعد مستقل طور پر عشق کی تعریف میں انیس [19] شعر لکھے ہیں جو "در تعریف عشق خانماں آباد آزادگاں برنا ہناد" کی سرخی سے شروع کئے جاتے ہیں یہ اشعار بھی خوب ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں:-

زہے عشق نیرنگ سازی تری | کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری
تجھی سے ہے آب رخ زرد، زرد | تجھی سے مرے دل میں اٹھتا ہے درد
تجھے ربط کفار و دیندار سے | تجھے رشتہ تسبیح و زنار سے
تجھی سے ہے بلبل کی نوحہ گری | تجھی پر ہے قمری بھی خاکستری
ترا جذب دریا کو بہنے نہ دے | ترا شور صحرا کو رہنے نہ دے
ترا کام دنیا ہے بدنامیاں | تری ریجھ دیکھی ہیں ناکامیاں

اس قسم کے اشعار کے بعد ایک درویش کی زبانی قصہ سنایا جاتا ہے جس میں ایک نوجوان کے عشق کا واقعہ اور پھر معشوق کی بے توجہی پر اس کا جان دینا نہایت دلچسپ اور درد انگیز طریقے پر بیان کیا ہے۔ اس کے آخر میں "مقولہ شاعر" کی سرخی کے تحت لکھتے ہیں :-

عجب کی نہیں جانہ کھا پیچ و تاب   یہ بیراب جو ہے عشق خانہ خراب
سنا ہے کہ فرہاد پر کیا ہوا   پر اس عشق نے شیریں سے کیا کیا

اس قسم کے بارہ شعر لکھنے کے بعد ساقی سے مخاطب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

کہیں ساقی دے آب گلرنگ کو   کشادہ بھی کر اس دل تنگ کو
گلے لگ کے مینا کے ٹک رو دئے   فسانہ بھی آخر ہے اب سوئیے

(۴)

محبت اور اس کی عالمگیریوں کے طول طویل مباحث کے بعد میر کی عشقیہ مثنویوں کا نمایاں اور قابل ذکر عنصر ان کیفیات کے مرقعے ہیں جو عشق سے متاثر ہونے کے بعد عاشق مزاج پر طاری ہوتے ہیں۔ یہ بیانات حد درجہ کامل اور مستند کہے جا سکتے ہیں اس لئے کہ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو میر کے ذاتی تجربات پر مبنی ہیں اور ان کے دلی جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مثنوی دریائے عشق میں جب ایک خوبصورت عاشق مزاج نوجوان ایک کوچے کے کسی غرفہ میں کسی مہ پارہ نازنین کو دیکھ پاتا ہے تو اس کا

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ　　صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بیقراری نے کج ادائی کی　　تاب و طاقت نے بیوفائی کی
دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز　　رنگ چہرا کیا کر چلا پرواز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک　　چاک کے پہنچے پاؤں داماں تک
طبع نے اک جنوں کیا پیدا　　اشک نے رنگ خوں کیا پیدا
خاطر افگار خار خار ہوئی　　جاں تمناکش نگار ہوئی
خو ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ　　رابطہ آہ آتشیں کے ساتھ
کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے　　رو دیا اُن نے ایک حسرت سے

بیقراری کا بے طرح بڑھنا، ناتوانی پیدا ہونا، چہرے کا رنگ اڑنا، کپڑے پھاڑنا،

طبیعت پر جنوں کی سی کیفیت کا طاری ہونا، ہمیشہ اپنے معشوق کا خیال رہنا، اور اسی خیال کے باعث آہوں کی کثرت، نیز اگر کوئی شفقت سے کچھ پوچھے تو بے اختیار رو دینا محبت کے کسقدر بہترین اور حقیقی مرقعے ہیں !!

اور ایک مثنوی مسمی بہ " جوشِ عشق " میں کسی پر عاشق ہونے کے بعد خود ان کی جو حالت ہوئی تھی اس کا مرقعہ حسبِ ذیل ہے۔ کسقدر صحیح کیفیتیں بیاں کی ہیں!

یعنے میر اک خستہ غم تھا — سرتاپا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اسکی اک جا گہ — بیخود ہو گئی جان آگہ
تاب و تواں و شکیب و تحمل — رخصت اس سے ہو گئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی — بے تابی نے طاقت پائی
خون جگر ہو بہنے لاگا — پلکوں ہی پر رہنے لاگا
خواب و خورش کا نام نہ آیا — ایک گھڑی آرام نہ آیا
سوز سے چھاتی تابہ گویا — اور پلک خوں نابہ گویا
آہ سے اسکی مشکل جینا — درد فقط تھا سارا سینہ
دل میں تمنا داغ جگر میں — شیون لب پر یاس نظر میں

شاعر انسانی جذبات و محسوسات کی ننگی تصویریں کھینچ دیتا ہے اور جب انساں کو اسکی اپنی تصویر کے مختلف اور صحیح رنگ دکھلائے جائیں تو ان کا جو اثر دل پر ہوتا ہے وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتا، اگر شاعر کا جذبہ صادق ہے، اگر اس نے انسانی فطرت کا

گہرا مطالعہ کیا ہے اور اگر اس کے تخیل میں زور ہے تو یقیناً اس کا کلام موثر ہوگا یہی وجہ ہے جو میر کی قنوطیت "افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" کے کلیہ سے مستثنیٰ ہو جاتی ہے اور ان کے "نشتر" "جگر کو بجائے کاہش کے لذت" بخشتے ہیں۔

ایک انشاء پرداز نے کسقدر ٹھیک کہا ہے کہ "کسی شاعر کے کلام کے مطالعہ کیوقت یہ سوچنا چاہیئے کہ گویا شاعر ہمارے ہی جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے"۔ اگر کوئی شخص عاشق مزاج ہے اگر کسی کے سینہ میں ایک درد آشنا دل ہے، اور اگر کسی نے عشق و محبت کی چاشنی چکھی ہو تو دردمند میر کے یہ اشعار پڑھنے کے بعد غالب کا ضرور ہم آہنگ ہو جائیگا کہ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اسنے کہا ✽ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے،

میر نہ صرف اپنی ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کو چلتا ہوا جادو اور بولتی ہوی تصویر کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں بلکہ جگہ جگہ ان خیالات اور واقعات کو بھی منکشف کرتے جاتے ہیں جو ان کے یا کسی اور کے خراب و اشفتہ حال ہونے کے بعد حوالی موالی سے سرزد ہوتے ہیں چنانچہ

جو کہ سمجھے تو اسکو دیوانہ　　رحم کھاتے تھے آشنا یا نہ
عاشق اسکو کسی کا جان گئے　　سب برا اس ادا سے مان گئے
کیوں کہ باہم معاش تھی سب کی　　ایک جا بود و باش تھی سب کی
وارث اسکے بھی بدگمان ہوے　　درپۂ دشمنی جان ہوے

مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں	دفعتاً اس بلا کے تئیں ٹالیں

لیکن بدنامی کے ڈر سے کہ ایک ہنگامہ مچ جائیگا کہ اس نوجوان کو کس نے مارا اور کیوں مارا؟ اس برے کام سے باز آتے ہیں لیکن اسکو دیوانہ مشہور کرکے اوباشوں اور گلی کوچوں کے لڑکوں کو اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جدھر نکلتا ہے اس کے ساتھ ایک ہنگامہ مچا رہتا ہے۔ لیکن اسکی اسکو کوئی پروا نہیں ہوتی، وہ اپنے دوست ہی کے خیال میں مگن رہتا ہے، دیوانوں کی طرح کبھی اپنے آپ میں کہہ اٹھتا ہے، کبھی بادصبا سے مخاطب ہو کر گفتگو کرنے لگتا ہے اور کبھی معشوق کو حاضر سمجھ کر باتیں شروع کر دیتا ہے۔

جب یہ خبر تمام شہر میں مشہور ہو جاتی ہے اور اس عورت کے گھر والوں کو بدنامی کا ڈر ہونے لگتا ہے تو وہ اسکو کہیں باہر بھجوا دیتے ہیں۔ اس روانگی کی عاشق کو بھی خبر ہو جاتی ہے اور وہ بھی اس کے محافہ کے پیچھے پیچھے نکل پڑتا ہے اور لطف یہ کہ خاموش نہیں چلتا بلکہ گفتگو میں محو ہے اس گفتگو کے ذریعہ اپنی حالت زار اور معشوق کی بے پروائی کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ یہاں غالب کے ان اشعار کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے جن میں انہوں نے بھی تقریباً یہی مطالب ادا کئے ہیں اور ممکن ہے کہ غالب نے یہ خیالات میر کی اس مثنوی سے اخذ کئے ہوں چنانچہ ہم ذیل میں دونوں کے اشعار پیش کرتے ہیں تاکہ دونوں شاعروں کی شخصیت اور مخصوص اسلوب بیان کے علاوہ ان کے اس خاص ذہنی طریقہ عمل کا کافی اندازہ ہو جائے جس کے ذریعہ وہ کسی حقیقت

کی طرف بڑھتے ہیں۔ میر کہتے ہیں:۔

تو تو واں زلف کو بنایا کی
جان یاں پیچ و تاب کھایا کی

تجھ کو تھی اپنے خال رخ پہ نگاہ
دل مرا مبتلائے داغ سیاہ

تجھ کو مد نظر تھی اپنی چال
میں ستمکش ہوا کیا پامال

بستر خواب پر تجھے آرام
مجھ کو خمیازہ کھینچنے سے کام

واں لب لعل تیرے خنداں تھے
یاں فشردہ جگر پہ دنداں تھے

غالب کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

واں کرم کو عذر بارش تھا عناں گیر خرام
گریہ سے یاں پنبہ بالش کف سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجوم اشک سے تار نگہ نایاب تھا

جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا

یاں سر پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرق ناز محو بالش کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بیخودی
جلوہ گل واں بساط صحبت احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ایک اپنے ذاتی قلبی واردات کو بالکل سادہ طریقہ پر بیان کر رہا ہے، دوسرا نہایت تکلف کے ساتھ اور غور کر کر کے لکھ رہا ہے، ایک میں آمد ہے اور دوسرے میں آورد، حالی جنہوں نے آمد اور آورد کے مروجہ معنوں سے اختلاف کیا ہے ممکن ہے کہ دوسرے کو بھی آمد ہی قرار دیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ میر کا دماغ اسوقت

ایک سرجیون سرچشمہ بنا ہوا ہے، جس میں سے خیالات کی موجیں نکل نکل کر روانی کے ساتھ آگے کو بڑھتی چلی جا رہی ہیں، اور غالب کی تخیلی سوتیں رکی ہوئی ہیں تاہم وہ خاص مستعدی اور جفاکشی سے کام کر رہے ہیں تاکہ آخر کار سب اُبل پڑیں۔

اسی بیان کے سلسلہ میں ان اشعار کے اوپر ہی میر نے عشق و محبت کی اور ایک عالمگیر کیفیت کا اظہار کیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جب دو انسانی پیکروں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں تو ان کی روحانی اور وجدانی قوتیں بھی آہستہ آہستہ متحد ہونے لگتی ہیں اور بغیر کسی ظاہری ذریعہ کے بے تار کے پیغام کیطرح ایک کی قلبی واردات کو دوسرے کے قلب پر ظاہر کر دیتی ہیں۔ اس قسم کے واقعات انسانوں اور اُن انسانوں کی روزمرہ زندگیوں میں کثرت سے ہوتے رہتے ہیں جنکے دل کے وسیع پیمانے ایک دوسرے کی محبت میں شرابور، اور جنکے دماغ ایک دوسرے کے تصور کو خوشامدید کہنے کے لئے کشادہ ہو جاتے ہیں اگر ایک کو کچھ صدمہ پہنچتا ہے تو دوسرے کا دل دھڑکنے لگتا ہے اور

جنبش اُس کی پلک کو گر واں ہو — دل میں یاں کاوش نمایاں ہو
واں اگر ہو شکست کا سدباب — یاں رگِ جاں کو ہووے پیچ و تاب
واں اگر پاؤں میں لگے ہے خار — دل سے یاں سر نکالے ہے یکبار
یار کو درد چشم گر ہووے — چشم عاشق لہو میں تر ہووے

اس کے آگے انتہائے محبت کا اور ایک کلیہ روشناس کرایا جاتا ہے کہ ایک دوست اپنے دوسرے دوست میں اسقدر محو ہو جانا چاہتا ہے کہ وہ اپنے میں اسی کی مشابہت اور اپنے

ہر کام میں اسی کی تقلید کرنے لگتا ہے۔

جب حضرت اویس قرنیؓ کو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دانت غزوہ احد میں شہید ہو گیا ہے تو انہوں نے بھی اپنا ایک دانت توڑ دیا، لیکن معلوم نہ تھا کہ روحی خدا کا کونسا دانت شہید ہوا ہے لہذا حضرت اویس قرنیؓ نے سب دانت نکال دئے، یہ تھی انتہا محبت کی!! لارڈ بائرن اور اس کی شاعری کے پرستاروں نے یہانتک التزام کیا تھا کہ اسی کی طرح گلوبند باندھنا چھوڑ دیا اور اس کے ہونٹ جس قسم کے تھے ویسے ہی بنانے کی کوشش کرنے لگے، مشہور امریکن مصنف ایمرسن کی پیروی میں امریکہ کے جو انشاپرداز خود کو "امرسنی" کہا کرتے تھے ان کی یہ حالت تھی کہ شکل و شباہت، چال ڈھال، اور پوشاک وغیرہ میں حتی الامکان امرسن کی نقل اتارا کرتے تھے۔ میر نے اسی فطرت کو یہاں بھی پیش کیا ہے یعنے اگر معشوق کے دامن میں زینت کے لئے چاک ہوں تو عاشق گل کی طرح اپنے گریبان کو چاک کر لیتا ہے۔ تاکہ اس کی مشابہت پیدا کر سکے۔ لکھتے ہیں ؎

چاک دامن ہے واں پئے زینت — یاں گریباں ہے چاک گل کی صفت
واں دہن تنگ، یاں ہے دل تنگی — حسن اور عشق میں ہے یکرنگی

میر تقی اس مثنوی میں فطرت انسانی کے اور ایک راز کو منکشف کرتے ہیں، مشہور ہے کہ محبت اگر سچی محبت ہو تو بے اثر نہیں ہوتی۔ جب عاشق دریا میں ڈوب مرتا ہے تو معشوق سے رہا نہیں جاتا اور ؎

پس مردن بنائے جائینگے ساغر مری گل کے — لب جاں بخش کے بوسے ملینگے خاک میں مل کے

کی امید رکھنے والا عاشق اپنے محبوب کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ چنانچہ اس کی وفات کے بعد ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گذرنے پایا تھا کہ معشوق کے جذبات میں ہیجان پیدا ہونے لگتا ہے اسکے دماغ میں ایک تلاطم بپا ہوجاتا ہے۔ یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ بعض واقعات سے ہمارے دلوں پر وہ گہری چوٹیں لگتی ہیں کہ اس کے بعد ہی ہماری زندگی میں ایک محیر العقول انقلاب پیدا ہوجاتا ہے۔

میر تقی "اگر عشق اول در دل معشوق پیدا می‌شود" کے خیال کو ثابت کرنا نہیں چاہتے تو اسقدر ضرور کرتے ہیں کہ ایک فطری امر کا اظہار کردیں۔ ذرا اس نوجوان عورت کا اپنی دایہ سے گفتگو کرنے کا ڈھنگ اور وہ خاص اسلوب بیان ملاحظہ ہو جسکے پردہ میں وہ اپنے اصل مطلب کو چھپانا چاہتی ہے!۔

دل تڑپتا ہے متصل میرا — مرغ بسمل ہے یا کہ دل میرا
وحشت طبع اب تو افزوں ہے — حال جی کا مرے دگرگوں ہے
بیدماغی کمال ہوتی ہے — جان وتن کی وبال ہوتی ہے
دل کوئی دم کو خون ہوئیگا — آج کل میں جنون ہوئیگا
بیکلی جی کو تاب دیتی ہے — طاقت دل جواب دیتی ہے
جی میں آتا ہے ہوں بیابانی — پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی
مصلحت ہے کہ مجھ کو لیچل گھر — ایک دو دم رہینگے دریا پر
گاہ باشد کہ دل مرا وا ہو — ورنہ کیا جانئے کہ پھر کیا ہو؟

غرض دایہ اور وہ ملکر نکلتے ہیں، جب دریا پر پہونچتے ہیں تو اسکو بے اختیار رونا آجاتا ہے اور کشتی میں بیٹھکر دریا کو عبور کرتے وقت دایہ سے وہ مقام جہاں جوانمرگ عاشق غرق ہو گیا تھا، دریافت کر کے وہ بھی آخر کود پڑتی ہے۔

بالکل اسی طرح کا نتیجہ اور ایک عشقیہ مثنوی "دریائے عشق" میں بھی نکالا گیا ہے یعنے جب ایک نوجوان اپنے معشوق کی بے التفاتی معلوم کر کے جان دیدیتا ہے اور اس کے معشوق کو اس کی خبر ہوتی ہے، تو وہ بھی فوراً دنیا سے گذر جاتا ہے۔

اسی سلسلہ میں میر تقی میر کی اور ایک نقاشی قابل ذکر ہے، جب پرسرام کی بیوی جلا دیجاتی ہے تو اسپر اسکا جو اثر ہوتا ہے اسکو میر نے اسقدر عمدگی سے بیان کیا ہے کہ متقدمین شعرائے اردو میں سوائے میر حسن کے اور کوئی اس امر میں ان کا ہمسر نظر نہیں آتا۔ اور قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ میر حسن نے غالباً اسی مرقعہ کے چربہ پر بدر منیر کے رنج کی حالت کا نقشہ اتارا ہوگا، اور چونکہ وہ ایک عورت کے حالات و خیالات کا نقشہ پیش کر رہے ہیں، اس لئے انکا بیان میر تقی کے بیان سے زیادہ دلچسپ اور اصلی معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن میر تقی نے بھی اس قسم کا جو نقشہ پیش کیا ہے (اور جس کے چند شعر ہم نے ابھی اوپر نقل کئے ہیں) وہ کچھ کم اصلی اور واضح نہیں!! تاہم ایک مرد کی تصویر پیش کرنا بہ نسبت عورت کی کیفیت بیان کرنے کے زیادہ دشوار ہے اس لئے کہ عورت کی ماحولی فضا بہ نسبت مرد کی عملی کائنات کے بہت ہی محدود ہوتی ہے۔

اور غالباً یہی وجہ ہوگی کہ میر حسن نے جہاں بادشاہ کے رنج والم کا اظہار کیا ہے صرف دو تین ہی شعر پر بیان ختم کر دیا ہے۔ اور اسی طرح جب بینظیر کوئیں میں قید ہوتا ہے تو اس کی ماں کی

جو حالت ہیش کی ہے وہ بھی کچھ زیادہ اچھی اور واضح نہیں بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن تصنع اور تکلف پر اتر آئے ہیں، برخلاف اس کے میر نے جو تصویر دکھائی ہے وہ بالکل اصلی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً

جگر غم میں یک لخت خوں ہوگیا — رکا دل کہ آخر جنوں ہوگیا
گئے ہوش و صبر اسکے یکبار گی — طبیعت میں آئی اک آوارگی
سراسیمگی سے بگولا ہوا — پھرے اسطرح جیسے بھولا ہوا
نہ جی کو تسلی، نہ دل کو قرار — کف غم میں سر رشتہ اختیار
کبھو یاد کر اوس کو نالاں رہے — کبھو ٹک جو بھولے تو حیراں رہے
کبھو یاں، کبھو واں بحال خراب — وہی بیقراری وہی اضطراب
کبھو متصل ہونٹ پر آہ سرد — کبھو دست بر دل کہ دل میں ہے درد
ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد — لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد
کچھ اپنے بد و نیک کی سدھ نہیں — نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں

کبھو جا کے صحرا سے لا دیں اسے
کبھو رو گئے دریا پہ پا دیں اسے

(۵)

دوسری قسم کی مثنویاں جو نواب اودھ سے متعلق ہیں تعداد میں چھ ہیں تین صید نامے ایک کہ خدائی نواب، پانچویں آصف الدولہ کا ہولی کھیلنا، اور چھٹی ساقی نامہ۔

میر کا خیال تھا کہ جس طرح شاہنامہ، محمود غزنوی کی یادگار رہے اور جس طرح شاہ جہاں آ شاہ جہاں کے لئے کلیم نے لکھا تھا، میں نے بھی آصف الدولہ کے لئے بہ نظیر صید نامے لکھے ہیں تاکہ ان کا اور میرا دونوں کا نام باقی رہے۔ چنانچہ۔

زمانہ میں ہے رسم کہنے کی کچھ
امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ

کسو سے ہوئی شاہنامہ کی فکر
کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر

گیا شاہجہاں نامہ کہہ کر کلیم
دل شاعراں رشک سے ہے دو نیم

کنھوں نے کہی عشق کی داستاں
ہوا کوئی کھانے سے ہم داستاں

پئے آصف الدولہ میں نے بھی میر
کہے صید نامے بہت بے نظیر

مگر نام نامی یہ مشہور ہو
گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو

گو معاملات خارجی کے لحاظ سے میر کا درجہ اردو کے بعض شاعروں سے کمتر ہے تاہم ان تینوں مثنویوں میں انہوں نے شکار کے جسقدر تفصیل وار مرقعے پیش کئے ہیں وہ ضرور قابل ذکر ہیں کیا حسب ذیل بیانات سودا کے خارجی معاملات سے ٹکر نہیں کھاتے؟

شکار کیلئے نواب اور ان کے ہمراہی جنگل میں داخل ہو رہے ہیں۔

چلا آصف الدولہ بہر شکار | ہوا دبیاباں سے اٹھا غبار
روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ | لگے کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
طیور آشیانے سے جانے لگے | وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے

اثنائے راہ میں ایک مہیب دریا حائل ہوتا ہے اور سب لوگ اسکو عبور کرنے کی فکر میں ہیں، اس کی تصویر کسقدر اصلی پیش کی ہے!!

ہوا حائل راہ بحر عمیق | کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق
تیر آب کے اتری یہ خاطفی فوج | کہ بیڈول اٹھتی تھی ہر ایک موج
غضب لجہ خیزی بلا جوشش پر | تلاطم قیامت لئے دوش پر
تردد میں ہر اک کہ ہوں کیونکہ پار | کنارے پہ سرگشتہ گرداب وار
رواں آب ایسی روانی کے ساتھ | کہ جوں رفتگی ہو جوانی کے ساتھ

صیدنامہ کی دوسری مثنوی میں فوج کے جنگل میں داخل ہونے کے بعد جانوروں کی جو حالت ہوتی ہے اس کا کسقدر مکمل نقشہ اُتارا ہے!!

پلنگوں نے کہسار کی راہ لی | نہنگوں نے دریا کی جا تاہ لی
بچرے جو تھے دام سے چھا گئے | کشف نیچے ڈھالوں کے گھبرا گئے
شغال اور روباہ و خرگوش سے | نہیں بحث کچھ، یہ ہیں بے ہوش سے
کوئی ڈھونڈھتا ہے بیاباں میں جھاڑ | کوئی چاہے ہے پہاند جاؤں پہاڑ
کہ شاید یہ اودھر نہو کل مکل | کوئی دن جئے اس بلا سے نکل

غرض صید نامے کی تینوں مثنویاں اس قسم کے مرقعوں سے بھری پڑی ہیں۔

کدخدائی نواب آصف الدولہ کی مثنوی میں ایک ساقی سے مخاطب ہوکر ماحول کی رنگ رلیوں اور سرمستیوں کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ اس میں جلوس کا جو سماں کھینچا ہے وہ ضرور قابل ذکر ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں :-

ہے سواری کے فیل کی وہ دھوم — جیسے ابر بہار آوے جھوم
آئی دولت سرا سے ہو کے سوار — لعل ناب و گہر ہیں صرف نثار
اک مہابت کے ساتھ فیل نشاں — آگے مانند کوہ زر کے رواں
اور ہاتھی ہیں جھومتے جاتے — جیسے آویں جوان مدہ ماتے
پلٹنیں جاتی ہیں برابر یوں — صف مژگاں ہو دلبروں کی جوں
بال بستہ رکاب میں ہیں سرنگ — جنکے دیکھے کمیت چرخ ہی دنگ
چوب نقارے پر لگا اس ڈھب — کہ رکھیں گوش اس صدا پر سب
پھینکتے ہیں جو دستہ دستہ گل — رہگذر میں ہیں رستہ رستہ گل

ساقی نامہ اور ہولی کی مثنویوں میں آتشبازی اور رنگ کھیلنے کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ بھی نہایت دلچسپ ہیں، یہ دونوں مثنویاں نواب آصف الدولہ مرحوم کے عہد حکومت کی شان و شوکت اور عیش و عشرت کی تصویریں ہیں۔ ساقی نامہ کی مثنوی کے اختتام کے قریب نواب کی مدح شروع کی گئی ہے کہ

منعقد مجلس شبانہ ہے — ادب آصف زمانہ ہے

اور پھر دعا کرتے ہوئے کہ

عمر و دولت ہو اسکی حد سے زیاد　　　ہے اُسی سے جہاں نشاں آباد

ایک طویل غزل پر مثنوی ساقی نامہ ختم کی گئی ہے۔



(۶)

تیسری قسم کی مثنویاں دو طرح کی ہیں، ایک وہ جو پر بیتی کہی جاسکتی ہیں اور دوسری وہ جو آپ بیتی ہیں۔

جو مثنویات پر بیتی ہیں خاص طور پر شامل کیجاسکتی ہیں وہ یہ ہیں :۔ مرغبازاں، ساقی نامہ ہولی، جھوٹ، منو ابوزینہ، موہنی بلی، تنبیہۃ الجہال، ہجو نا اہل، مذمت آئینہ دار، ہجو عاقل، تعریف سگ و گربہ، تعریف مادہ سگ، مذمت برشگال، ہجو اکول، مرثیہ خروس، تعریف آغا رشید، ساقی نامہ، بکری نیز درباری مثنویوں کو بھی پر بیتی ہی میں داخل کرنا چاہیئے۔

ان تمام مثنویوں کے مطالعہ کے بعد ہمیں میر کے ماحول کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہ اس زمانہ کی جملہ کیفیتیں اسلامی شان و شوکت کی آخری جھلکیاں تھیں اور جسطرح کہ عام طور پر سلطنت کا مہاتی دور ختم ہونے کے بعد اس کے آخری دور میں عیش و عشرت کی زیادتی ہونے لگتی ہے اور بیہودہ مراسم رائج ہو جاتے ہیں، ہندوستانی اسلامی حکومت کا بھی یہی انجام ہوا چنانچہ بادشاہوں اور امرا کے عیش پسند ہونے کی وجہ سے رعایا بھی قسم قسم کی بدعنوانیوں پر آمادہ ہوگئی تھی۔ میر کے زمانہ میں جب کسی بادشاہ یا امیر کی شادی ہوتی تو کئی دن پہلے ہی سے تمام شہر میں آرائش ہونے لگتی تھی۔ رستوں پر تماشائیوں کا ہجوم رہا کرتا، اور ہر طرف

کا نشانہ بنایاں رہ گئی ہیں سو ٹھا صکر شادی کی رات میں بے حد دھوم ہوتی تھی، چراغوں اور اناروں کی اسقدر کثرت ہوتی کہ راتیں دن معلوم ہونے لگتیں اور تمام گلی کوچے باغ وبہار نظر آتے۔

بادشاہ ہو یا کوئی بڑا امیر اپنی شادی کی تقریب میں بخششوں کا بازار گرم کر دیتا تھا، ہر شخص کو اس کے مرتبہ کے مطابق انعام واکرام یا خلعت عطا کی جاتی تھی اور ارباب نشاط خاص اہتمام کے ساتھ گانے بجانے اور ناچنے کے لئے طلب کئے جاتے تھے۔

جب شادی کا جلوس نکلتا تو سب سے پہلے نشان کا ہاتھی ہوتا تھا جو زرق برق آرائش کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا سونے کا پہاڑ چل رہا ہے۔ اس کے بعد کئی اور ہاتھی ہوتے تھے جو مست نوجوانوں کی طرح چلتے تھے، ان تمام کی زیب وزینت زمین پر وہی سماں پیدا کر دیتی تھی جو آسمان پر تاروں سے ہویدا رہتا ہے، جلوس کے آخر میں خاص سواری کا ہاتھی ہوتا جو ابر بہاری کی طرح جھومتا ہوا جاتا تھا، برابر برابر پلٹنیں چلتی تھیں، رنگ برنگ کے خوبصورت اور شوخ وشنگ گھوڑے عجیب بہار دکھایا کرتے تھے۔ لوگ ہر دلعزیز بادشاہ یا امیر کے جلوس کے وقت اس کثرت سے پھول پھینکتے کہ رستوں میں ہر طرف گل بکھرے ہوئے نظر آتے تھے۔

ہر سال ہولی کی عید عام طور پر ہندو مسلمان دونوں ملکر مناتے تھے، اور اسلامی بادشاہ وامراء اس میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ اس زمانہ میں ایک دوسرے پر رنگوں کے شیشے کے شیشے ڈالے جاتے تھے جنکی وجہ سے مکانوں کے صحن رشک

بوستاں"بن جاتے تھے اور جبطرف نظر پڑتی پھول پھلواری ہی دکھائی دیتی تھی۔ مختلف رنگوں میں بھیگے ہوئے نوجوان اسطرح چلتے پھرتے تھے جسطرح نہروں پر گلدستے بہتے رہتے ہیں، گلال بھر کر ایک دوسرے پر قمقمے مارے جاتے اور وہ جس کو آن لگتے تھے اس کا سارا منھ لال کر دیتے تھے، عبیر جسکے ساتھ کاغذ کے پھول کی پتیاں کتر کر اڑائی جاتی تھیں، تمام فضا کو رنگین بنا دیتی تھی۔

اپنے اپنے کوچوں اور بازاروں میں امیر امراروشنی کرتے تھے، جسکے دیکھنے کے لئے جوق درجوق لوگ جمع ہوتے تھے اور ہر طرف ایک دھوم مچی رہتی تھی۔ دریا کے دونوں طرف روشنی کی ٹٹیاں باندھی جاتیں جسکا عکس پانی میں عجیب عالم دکھاتا تھا، گنبجوں کی قطاریں چھوٹ چھوٹ کر ایک مستقل باڑ کی شکل میں نمودار ہوتی تھیں اور جہاں کہیں مہتابی چھٹتی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چاند نکل رہا ہے۔ اہل فرنگ نواب آصف الدولہ کی نذر کے لئے قسم قسم کی آتش بازیاں لے آتے تھے، خاص ہولی کی رات بڑی شان وشوکت اور تزک واحتشام کے ساتھ نواب کی سواری نکلتی تھی اور عجیب عجیب طرح سے رنگے ہوئے ہاتھی ایک خاص لطف پیدا کرتے تھے،

اسوقت دوکاندار بھی اپنی اپنی دوکانیں حتی الامکان آراستہ کرتے تھے، دوکانوں کے سامنے رنگ برنگ کے ستون لگائے جاتے، کاغذ کے پھول کتر کتر کے مصنوعی گلدستے اس سلیقہ سے بنائے جاتے تھے کہ اصلی نظر آتے تھے۔

راستوں پہ رقاص عورتوں کے لئے تخت چنے جاتے تھے، جگہ جگہ نہایت خوش الحان منڈلی

کے ساتھ نوبتیں بجتی تھیں، اچھے اچھے لوگ سوانگ بن بنکر نکلتے تھے، کوئی جوگی، کوئی فقیر، کوئی حاجی، کوئی پیر، زاہد، بنیا، اوباش، سپاہی، تاجر، خمار یا شاعر بنتا اور طرح طرح کی نقلیں کی جاتیں۔ اور ان میں اس کمال کے ساتھ اصلیت پیدا کرنے کی کوشش ہوتی تھی کہ اصل اور نقل میں بہت کم امتیاز کیا جا سکتا تھا۔

بادشاہ اور امرا خاص اہتمام سے شکار کے لئے نکلتے تھے، ان کے ساتھ زبردست فوجیں ہوتی تھیں جنکی آمد آمد کی شور سے جنگلوں کے تمام جانور سراسیمہ ہو کر بھاگنے لگتے، ہاتھی بکریوں کے مانند پکڑے جاتے تھے، اور قوی ہیکل شیر و ببر خوف کے مارے لرزنے لگتے تھے۔ چیتل، پاڑہ، ارنا، ریچھ، سارس، ہرن، نیلا، خرگوش، لومڑی، گھڑیال، سوسما، طاوس، بلبل، قمری، سرخاب، مرغابی، کچھوے، مگرمچھ، خاز، بطخ، کلنگ، قرقرہ، تیتر، بٹیر، غرض ہر قسم کے جانوروں کا شکار اس کثرت کے ساتھ کیا جاتا تھا کہ ساری فوج گوشت ہی گوشت کھاتی رہتی تھی، تالابوں اور نہروں میں اس شدت سے جالے ڈالے جاتے تھے کہ مچھلیوں کے تودے کے تودے ہاتھیوں پر لاد کر شہر میں لائے جاتے تھے۔

اور جب یہ تمام فوج شکار کے بعد جنگل سے واپس ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگل کو کسی نے جھاڑو دیدیا ہے، نہ تو جانور نہ سبزہ، نہ تو کھیتی اور نہ پانی غرض کوئی چیز کسی جگہ بھی اچھی حالت میں نظر نہ آتی تھی۔

مرغبازی کا (خاص طور پر لکھنؤ میں) بیحد شوق تھا۔ لوگ مرغوں کو خاص اہتمام کے ساتھ پالتے اور لڑائی سکھاتے تھے، بڑے بڑے آدمی بھی "مرغ بغل میں" مارے نکلتے تھے

لکھنو کے مرغوں کی خصوصیات کی دھوم حیدر آباد تک مچی ہوئی تھی، مرغ والوں کو اپنے مرغ کا اسقدر، "وقر" تھا کہ جان دینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے لیکن اپنے مرغ کا ایک انڈا تو کجا ایک پر دینا بھی گوارا نہ کرتے،

مرغوں کی بازیاں بد بد کر لڑائی جاتی تھیں، اور ان میں حد درجہ دلچسپی لی جاتی تھی ہر جمعہ اور منگل کو ان تماشوں کی دھوم مچی رہتی تھی، اُدھر مرغ لڑتے تھے اور اِدھر مرغباز اپنا جوش دکھاتے تھے، مرغوں کی لڑائی کیا ہوتی تھی جاہلوں اور اوباشوں کا ایک اچھا خاصہ مناقشہ ہو جاتا تھا، ابھی مرغ لڑنا شروع بھی نہیں کرتے تھے کہ ان جاہلوں میں سیکڑوں قسم کی باتیں ہو جاتی تھیں، غرض نصف النہار تک ایک عجیب ہنگامہ مچا رہتا تھا، لڑائی کے بعد مرغباز زخمی مرغوں کو بغل میں مارے اپنے اپنے مسکنوں کی طرف رخصت ہوتے تھے اور آنیوالے مقررہ دن کا سختی سے انتظار کرتے۔

مرغوں کے علاوہ، بلی، کتے اور بندر بھی شوق سے پالے جاتے تھے۔

اس زمانہ میں عورتوں کے متعلق عام طور پر بڑے خیالات مشہور تھے کہ وہ فطری طور پر مکار ہوتی ہیں۔ ان کا فریب سارے جہان میں مشہور ہے، قرآن پاک میں بھی ان کے مکر کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اکثر ناقص العقل ہوتی ہیں، اور کبھی کسی سے وفا نہیں کرتیں، عورت ظاہر میں لاکھ رشک ماہ کیوں نہ ہو باطن میں ضرور مار سیاہ ہوتی ہے، اس کے علاوہ نوجوانوں کا مذاق بھی بگڑ چلا تھا، امرد پرستی فیشن میں داخل ہو گئی تھی، اور مردوں میں نسائیت نمائی کا شوق بڑھتا جا رہا تھا۔

غلط معتقدات اور توہمات بھی شدت کے ساتھ جڑ پکڑتے جارہے تھے، چنانچہ جب کسی عورت کے بچے نہ جیتے تو اس کی کوکھ کی حفاظت لازمی سمجھی جاتی تھی، جھاڑ سے پھونکنے کا عزم کیا جاتا، نذریں مانی جاتیں، نقش ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے جاتے، تعویذ لکھے جاتے، روٹیوں پر افسوں کرتے، بے بلائی سے التجا کی جاتی، گریۂ محراب سے دعائیں مانگی جاتیں، ماش کی موٹی موٹی روٹیاں پکائی جاتیں، اور لڑکیوں کو کھاٹوں تلے بٹھایا جاتا، آدھی رات کے وقت مناجاتیں کی جاتیں، اور متفرق پیروں اور ولیوں سے مرادیں مانی جاتیں۔

باہر نکلتے وقت بلی کا آگے آنا یا چھینکنا بدشگونی سمجھا جاتا تھا۔

اس زمانے میں دیہات کی حالت نہایت خراب ہو چلی تھی، حکام کو صرف تحصیل وصول کرنے سے کام تھا، رعایا کی آسودہ حالی اور بہبودی کی فکر نہ تھی، آئے دن مرہٹے، سکھ اور روہیلے حملے کیا کرتے تھے جنکی وجہ سے تمام آبادیاں اُجاڑ ہوگئیں تھیں معمولی معمولی لوگ بھی دہلی کے بادشاہ کی خستہ حالت سے ہمدردی کرتے تھے،

نائیوں کی اس زمانے میں بیحد قدر کیجاتی تھی، یہ لوگ کئی کام کرتے تھے، مشعلیں لیکر مجلسوں میں جانا، غسل دینا، جراحی اور کبھی کبھی طبابت بھی یہی لوگ کیا کرتے تھے۔ جب کبھی وہ بگڑ جاتے تھے تو ایسا روٹھ کے بیٹھتے اور خوشامد کراتے جیسا کوئی نوآمدہ ایرانی خفا ہو جاتا اور خوشامد کراتا تھا۔ میر کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ نئے نئے ایران سے آتے تھے ان کی بڑی عزت و مدارات کی جاتی تھی۔

اس زمانہ میں اخلاقی حالت بھی گرتی جا رہی تھی، اکثر لوگ جھوٹ کے عادی تھے، خصوصاً دفتری جھوٹے وعدے کرکے غریبوں کو ستایا کرتے تھے،

علم وفضل اور سنجیدہ دماغی معدوم ہوکر بد ذوقی پیدا ہوتی جا رہی تھی، شعر و شاعری کا بازار گرم تھا، آئے دن مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے، جن میں ہر وقت، ایک نت نیا مسخرہ شاعر کی حیثیت سے روشناس کرایا جاتا تھا، حشرات الارض کیطرح شاعروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، نالایق اور بد کردار لوگ کم عمر اور جاہل نوجوانوں کو اپنا شاگرد رشید بناکر استادانِ فن کی صف میں لا بٹھاتے تھے، جسکی وجہ سے مذاق میں خرابیاں پیدا ہوتی جا رہی تھیں اور حقیقی شاعری مفقود، ہر مشاعرہ ایک ہنگامہ ہوتا تھا، جہاں کہیں کوئی استاد غزل پڑھنے لگتا تو لوگ نیم قدر اٹھ اٹھ کے اس کے کلام کو سنتے اور سر دھنتے تھے۔

اپنے ماحول کی تمام بدعنوانیوں سے بیزار ہوکر میر تقی نے کئی دفعہ درد انگیز صدائیں بلند کیں لیکن وہ تمام صدا بصحرا بنکر رہگئیں۔ آخر کار بالکل بیزار ہوکر دنیا کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی ہے جس میں اپنی زندگی کے انقلاب اور معیبتوں کو پیش کرتے ہوئے عبرت آموز سبق دیتے ہیں کہ اے ہوش وعقل رکھنے والے دوستو! سنو کہ ایک روز اس دنیا سے ضرور کوچ کرنا ہے، پیغمبر، بادشاہ اور فقیر سب کو ایک نہ ایک دن یہی راستہ درپیش ہے۔ ایک زمانہ آئیگا کہ تم ہماری یہ باتیں یاد کروگے کہ ہم نے کہا تھا کہ

ع نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی۔

باغ کی رنگینی ایک بوئے خوش ہے جو دم بھر میں ہوا ہو جاتی ہے، گلہائے تر جھڑ جھڑ کر خاک میں ملجاتے ہیں، مرغان گلشن کے رنگ برنگ کے پر پریشان ہوجاتے ہیں، نہ کیاریاں باقی رہتی ہیں نہ باغ کا چلتا ہوا پانی، ایک دن تمام چمن ایک ہو کا مکان ہوجائیگا، زمین اس حالت میں نہ رہیگی اور آسماں کاغذ کے تاؤ کے مانند لپیٹ دیا جائیگا۔

زور

(۷)

میر کی جن مثنویوں سے ان کی آپ بیتی کے متعلق زیادہ معلومات اخذ کئے جاسکتے ہیں ان میں حسب ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:- سفر برسات، اپنے گھر کا حال، اژدر نامہ، ہجو خانہ خود، دنیا، خواب و خیال۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ میر کی آپ بیتی کیلئے اس فصل میں اور اُن کے ماحول کے متعلق گذشتہ بیان میں ہمنے جن جن واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ تمام صرف وہی ہیں جو محض ان کی مثنویوں سے معلوم ہو سکتے ہیں، ان کے دیگر کلام یا متفرق تذکروں کے مطالعہ سے ان کی زندگی اور ان کے زمانہ پر جو روشنی پڑھ سکتی ہے ہم نے اس سے قطعی گریز کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ کام میر تقی میر کے سوانح نگار کا ہے نہ کہ انکی مثنویوں پر تنقیدی نظر ڈالنے والے کا۔

میر اکبر آباد میں پیدا ہوے تھے، اُنکا عہد طفولیت وہیں گذرا، عالم شباب میں جبکہ ان کی عمر بیس سال کی تھی، دہلی کی طرف کوچ کیا۔ آگرہ میں ان کی زندگی معمولی طریقہ پر بسر ہوتی تھی، عشق و محبت کے جذبات بچپن ہی سے ان کی فطرت میں ودیعت تھے، اور جوانی میں تو وہ سب شگفتہ ہونے لگے تھے، جب اکبر آباد سے نکلتے ہیں تو یہی محبت اُنھیں آٹھ آٹھ آنسو رولاتی ہے اور ترک وطن سے ان کے آبگینہ دل پر وہ ٹھیس لگتی ہے جو مرتے دم تک ان کی مشہور آفاق قنوطیت کو تازہ رکھنے کے لئے کافی تھی۔

دلی میں پہونچنے کے بعد ان کی حالت ذرا خراب ہو گئی، اور آخر میں یہانتک نوبت

پہونچی تھی کہ جنون ہو گیا، اور چاند میں بھی انھیں اپنے معشوق کی صورت دکھائی دینے لگی، جسکو دیکھنے سے ان کی حالت اسقدر خراب ہو جاتی تھی کہ منھ میں کف آنے لگتا اور وہ بیہوش ہو کر گر جاتے، ان کے خیر خواہ اس سے بہت پریشان ہوئے اور طرح طرح کے علاج معالجہ کئے گئے، لیکن نہ آنکھ کھلی رہنے پر وہ شکل نگاہ سے ہٹتی تھی اور نہ بند رہنے پر، کسی نے پریخواں کو بلا کر افسوں پڑھوایا، اور کوئی کسی کے پاس سے تعویذ لایا، غرض متفرق طبیبوں کو بلایا گیا اور ایسی ایسی چیزیں کھلائی گئیں جو کھانے پلانے کے قابل نہ تھیں اور ایسی ایسی دوائیں استعمال کرائی گئیں جو ان کے مزاج کے بالکل مخالف تھیں، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سخت بیمار اور کمزور ہوتے گئے۔ آخر کار کئی دفعہ انکی فصد لیا گیا اور اسقدر خون نکالا گیا کہ وہ اس کے بعد مسلسل بیہوش رہنے لگے، لیکن اس سے ان کو بیحد فائدہ بھی ہوا، اور وہ وہی صورت ان کی نگاہوں سے مفقود ہو گئی، کسی کو بھی امید نہ تھی کہ وہ زندہ بچ جائینگے۔

دہلی میں حالانکہ بہت بری حالت سے گذرتی تھی لیکن اونھوں نے اپنا وقار برابر قائم رکھا اگرچہ وہاں اُن کے جانے سے قبل شعر و شاعری کا بازار کچھ سرد سا ہو گیا تھا، لیکن ان کی شاعری نے تمام شاعر مزاجوں میں از سر نو جان ڈالدی۔ ان کی بڑھتی شہرت دیکھکر بعض شاعر حسد کرنے لگے، اور انکی ہجوئیں لکھیں۔ میر تقی پہلے تو بہت خاموش رہے لیکن آخر تنگ ہو گئے اور ہجو یہ جواب دینا پڑا۔ چنانچہ مثنویات اژدر نامہ، انھی مدافعانہ کوششوں کے نتیجے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آج کل جو شاعر بنے بیٹھے ہیں وہ سب پہلے

لونڈے تھے، اور میرے ہاں مدتوں آیا کرتے رہے، کوئی میری نظرِ عنایت کی وجہ سے آدمی بنا، کوئی مشہور ہوا، کسی نے میرے دیوان کی نقل لی، کوئی میری طرز پر شعر کہنے لگا اور کوئی میرا پیرو بنگیا ہے

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

میں سب کو دور سے بیٹھا ہوا دیکھا کرتا ہوں، اکثر "سر کھینچو" میرے مستفیدین کوئی میری حقیقی قدر کرے نہ کرے لیکن آخر پایئں پایئں ہے اور صدر، صدر خدا جس کو بزرگی دیتا ہے وہی بزرگ ہوتا ہے اور قبول خاطر و لطف سخن ایک خدا داد شے ہے ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی"

بعض لوگ مرزا رفیع کو میر کا مد مقابل بنا کر ان کی آڑ میں میر پر حملے کرتے اور ان کی ہجویں لکھتے تھے، لیکن میر نے مرزا کی کبھی مخالفت نہیں کی، وہ مرزا کو ہمیشہ اپنے برابر کا شاعر سمجھتے تھے، ان کی مثنویوں میں اکثر جگہ آیا ہے کہ یہ دور میر و مرزا کا دور ہے۔ جب وہ کسی معمولی شاعر کی شاعرہ میں تعریف ہوتی دیکھتے تو ان کو بہت برا معلوم ہوتا تھا، ان کی نظر میں بہت کم لوگ جچتے تھے۔

باوجود شاعرانہ کمال کے زمانے نے انھیں "متصل پراگندہ روزی پراگندہ دل" رکھا ان کا گھر ایک تیرہ و تاریک زندان کے مانند تھا، جس میں صحن بالکل تنگ اور کمرے چھوٹے چھوٹے تھے دیواریں جگہ جگہ سے جھکی ہوی تھیں لونی لگ لگ کے مٹی جھڑتی

رہتی تھی، بارش کے وقت تمام چھت چھلنی کیطرح ٹپکنے لگتا تھا ٹپکوں کی وجہ سے زمین میں جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے، جنکو وہ راکھ سے بھرتے تھے، دیواریں اسقدر کمزور ہو گئی تھیں کہ تیز و تند ہوا کے جھونکوں میں تھرتھر کانپنے لگتی تھیں طوطا مینا تو کجا اگر ایک پونڈ بھی پھدکے تو قیامت ہو جاتی تھی، ہر وقت گرنیکا خوف رہتا، اور عورتیں پریشان ہونے لگتیں کہ یارب اب کسطرح پردہ رہیگا، کبھی کوئی کوا یا چیل آن بیٹھتی تو لوگ اسطرح شور مچاتے جیسے کوئی تو آن بیٹھا ہے۔) پر چھتی نہونے کی وجہ سے اس پر بوریا ڈالنا پڑتا تھا، جو ایک ہی تھا اور نہایت خراب خستہ حالت میں تھا،

سارے مکاں میں صرف ایک کمرہ ایسا تھا جسکو اچھا کہہ سکتے تھے لیکن اس کی حالت بھی یہ تھی کہ کہیں چوہے بھاگتے نظر آتے تھے، کہیں گھونسیں کھود کھود کر ڈھیر لگاتی تھیں، اور کہیں چھچھوندر کے گھر دکھائی دیتے تھے، تمام کونوں میں مچھروں کا شور تھا، ہر جگہ مکڑی کے جالے لٹکے رہتے تھے، اور جھینگر کی تیز آواز کانوں کو سخت ناگوار گذرتی تھی، طاق ٹوٹے پھوٹے تھے، پتھر اپنی اپنی جگہ سے چھوٹے ہوئے تھے اور اینٹ چونا گرتا رہتا تھا،

اس حجرے کے آگے ایک ایوان تھا جس کے کڑی تختے دھوئیں سے سیاہ ہو گئے تھے اور انپر کبھی کبھی سانپ پھرتا ہوا دکھائی دیتا تھا، اور بعض وقت ہزار پائے گرتے تھے۔ کہیں کوئی تختہ ٹوٹتا تھا اور کہیں کوئی واسہ گرتا ہوا معلوم ہوتا تھا غرض ہر وقت دبکے مرنیکا خطرہ لگا رہتا تھا،

چھت کے اوپر سوراخ بند کرنے کے لئے جو مٹی کے تودے ڈالے گئے تھے ان کے وزن سے شہتیرین کمانوں کی طرح خم ہو گئی تھیں اور اسقدر اڈواڑیں دی گئی تھیں کہ مکان چہل ستوں نظر آتا تھا، دروازے کے سامنے اینٹ مٹی کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا، اور منڈیر آہستہ آہستہ گرتی جاتی تھی، کواڑ ٹوٹے ہوئے اور زلفی زنجیر بالکل پرانی تھی۔ جس پر بیحد زنگ لگا ہوا تھا۔

بارش میں جھانکوں کی وجہ سے جب بدرنگ پانی ٹپکتا تو میر صاحب کے کپڑے افشانی ہو جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہولی کھیلے ہیں۔ بوریا بارش کی وجہ سے بہت کم بچھایا جاتا تھا چارپائی تھی تو کھٹملوں سے بالکل سیاہ ہو گئی تھی کھٹمل انھیں رات کو بہت کم سونے دیتے تھے کھٹمل ملتے ملتے ان کی پوریں گھس جاتی تھیں اور سارے ناخن لال ہو جاتے تھے،

اس قسم کے مکان والوں کے لئے ظاہر ہے کہ بارش کا آنا طوفان کی آمد سے کم نہ تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ کی بارش میں ایک طرف کی دیوار گری اور ہمسائے ہمخانہ بنگئے، گھر راستہ ہو گیا اور کتے ہر وقت ستانے لگے، میر صاحب انھیں دھتکارتے بیزار ہو جاتے تھے، آخر کار ایک وقت تمام مکان گر پڑا اور ایک لڑکا بھی اس میں دب گیا لیکن لوگوں کی مدد اور مستعدی سے وہ زندہ نکلا۔

میر صاحب کو جانور پالنے کا بڑا شوق تھا، لکھنو میں ایک بکری بڑے شوق سے پالی تھی جو نہایت تیز مزاج تھی اُس کا رنگ سر سے پاؤں تک بالکل سیاہ

اور چکنا تھا، اُس نے دو کالے بچے جنے جنکو بڑی احتیاط سے بالا پوسا لیکن بڑے ہونے کے بعد وہ بہت شریر اور بدمست نکلے جنکی بدعنوانیوں سے میر کو اکثر غصہ آجایا کرتا تھا،

انکے پاس ایک دفعہ ایک کتے کا بچہ تھا جسکو انہوں نے بحسب احتیاج بیچنے نکالا، جسکے بعد انھیں ایک بندر ہات لگا، اس بندر کا نام منوا تھا اور اس کی شوخی ہر جگہ مشہور تھی اس بندر کی حرکتیں اکثر دلکش ہوتی تھیں لیکن اگر ہات میں لکڑی نہ ہو تو وہ اپنا بوٹا سا قد لئے اچکتا اور کپڑے پھاڑ ڈالتا تھا، اکثر بی بیاں اور لونڈیاں باندیاں اس سے ڈرا کرتی تھیں، اور وہ اتنا شریر تھا کہ رسّی ہو یا ڈوری یا زنجیر غرض کسی سے مقید نہیں رہ سکتا تھا، لیکن جب کسی سے وہ مل جاتا تو اس کی مار کھا کھا کر بھی ضبط کرتا تھا۔

جب کبھی وہ چھٹتا تھا تو ہر طرف شور اور ہنگامہ مچ جاتا تھا، وہ آدمیوں کو بندروں کی مانند نچا دیتا تھا، اس کے سارے ڈول آدمی کے سے تھے، آئینہ کے رو برو کھڑے ہو کر تماشے کرتا اور اپنے عکس سے گفتگو کرتا تھا، منوا کی خوشحالی اور چو رہنا میر کی شگفتگی اور زندہ دلی کے لئے ضروری تھا،

موہنی نام ایک بلی بھی میر صاحب کے گھر رہنے لگی، پہلے تو ایک دو کے ساتھ ہل جل گئی اور ادھر ادھر بہت کم جانے لگی، آخر میں خود میر صاحب سے ربط پیدا کیا اور یہانتک کہ صرف انہی کا ہاتھ دیکھتی رہتی تھی، علی الصباح اٹھکر ان کے

پاس آیا کرتی اور وہ جو کچھ چھیچھڑا اکھڑا ڈالدیتے اسی کو بہت کچھ سمجھتی اور کھا لیتی۔

یہ بلی اسقدر پاکیزہ خو تھی کہ چلنے میں کبھی آگے نہیں آتی تھی، اور نہ کبھی چھینکی تھی اگر کہیں کوئی چھینکا ٹوٹ کر گرتا تو خواہ وہ کتنی ہی بھوکی کیوں نہ ہوتی اس کی طرف مطلق نہ دیکھتی گو اسکا رنگ گہرا سیاہ تھا لیکن تمام حرکتیں دلکش اور قابل دید تھیں، وہ جلے پاونجی بلی کی طرح بہت کم پھرا کرتی تھی اور تمام ہمسائیاں اسکو اپنے پاس شوق سے بلا بلا کر لیجایا کرتی تھیں،

ایک دفعہ وہ حاملہ ہوئی اور کئی بچے دئے مگر وہ سب مرگئے تمام پر انکی موت شاق گذری اب اس کی کوکھ کی حفاظت کے لئے وہ تمام کوششیں کی گئی جو ایک عورت کی کوکھ کی حفاظت کے لئے اس زمانے میں کیجاتی تھیں، خدا خدا کرکے اس کے پانچ بچے ہوے اور وہ سب کے سب جی گئے، جب بچے دودھ پینے لگے تو میر صاحب نے ان کے لئے دودھ مقرر کر دیا اور سب لوگ ان کی سخت نگہداشت کرنے لگے۔

گائے بکری کا دودھ پی کر یہ بچے بڑے ہوے اور معلوم ہوا کہ سب ایک ہی ڈیل ڈول کے ہیں، دو مہینے تک ان کو کتا بلی وغیرہ سے جدا رکھا گیا، جہاں کہیں کوئی کتا نظر آتا لوگ شیر کی طرح منہ پھاڑ کر اس کی طرف دوڑتے تھے، غرض یہ مختلف رنگوں کے بچے سب کے چہیتے ہو گئے۔ ایک ایک کرکے تین بچے تو لوگ لے گئے اور سنی مانی دو بلیاں میر صاحب کے پاس رہگئیں۔ لیکن آخر میں

ان میں سے بھی ایک کو کسی صاحب نے پسند کرلیا اور وہ ان کے نذر ہو گئی۔

جو زیادہ موٹی تازی تھی وہ میر صاحب پاس رہ گئی اس بلی کو ان سے بہت انس تھا ان ہی کے بور لئے پر سوتی تھی، اور جب یہ نہ ہوتے تو ان کی منتظر رہتی اور کچھ نہ کھاتی، جب ان کی آمد کی آواز سن پاتی تو باغ باغ ہو جاتی اور سب سے پہلے دروازے تک آپہونچتی میر صاحب کو بھی اس بلی سے بہت محبت تھی انہوں نے مثنوی میں اس کی بڑی تعریف کی ہے۔

منی نے بھی آخرکار دو بچے دئے۔ موہنی اور سوہنی یہ دو نو بچے کھیل کود کر سارے گھر کو خوش کیا کرتے تھے، لیکن سوہنی پہلے مرگئی اور سب کو بڑا رنج ہوا۔ میر صاحب نے اس کو بلی ماروں میں گڑوا دیا۔

میر اگرچہ آخر میں بہت ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے لیکن شعر کہنا ترک نہیں کیا تھا نسیان کی زیادتی سے اچھے اچھے فراموش کر جاتے تھے، جوانی میں جس ڈھنگ سے شعر پڑھا کرتے تھے وہ لب و لہجہ بڑھاپے میں باقی نہ رہا تھا، بصارت اسقدر کمزور ہو گئی تھی کہ بغیر عینک کے بہت کم نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ سماعت میں بھی فرق آگیا تھا۔

آخر زمانہ میں ان کا قد خم ہو گیا تھا، اور ہر ایک عضو میں رعشہ پیدا ہو چکا تھا کبھی کھڑے ہوتے تھے تو ران اور پنڈلیاں تھرانے لگتی تھیں چہرہ کی رنگت اور بدن کی وضع قطع بالکل بدل گئی تھی، اور تمام جلد شکن آلود ہو گئی تھی،

(۸)

اُردو ادب میں نیچر کا لفظ ایک عجیب اہمیت رکھتا ہے مگر اسو جہ سے نہیں کہ اردو داں نیچر پرست ہیں یا اردو شعرا نے نیچر کے بہترین مرقعے پیش کئے ہیں، معلوم نہیں وہ ایسی کونسی بری گھڑی تھی جب کہ یہ لفظ سرسید کے قلم سے پہلی بار لکھا گیا کہ اسکی گونج سے ہندوستان کی ساری مذہبی فضا میں ایک تہلکہ برپا ہو گیا نہ صرف سرسید بلکہ جو کوئی ان سے ذرا بھی ہم آہنگ ہوتا، نیچری کہلاتا، اس پر چاروں طرف سے لعنتوں کی بوچھار ہوتی اور اس کے بعد سے پھر کسی امر میں خواہ وہ مذہبی ہو یا ادبی، سیاسی ہو یا اقتصادی اس کی بات کو کسی قسم کی وقعت نہ دیجاتی،

یورپ میں جو انشا، پرداز نیچر کی صحیح ترجمانی کرنے کی کوشش کرے، یا جو شاعر نیچر پرستی کو اپنی شاعری کا مطمح نظر قرار دے وہ ایک اعلیٰ قسم کا انشار پرداز اور صحیح المذاق شاعر سمجھا جاتا ہے، اس کی نیچر دوستی اس کے لئے باعث معراج بنتی ہے، نقاد اسکی نیچر پرستی کی مدحت طرازی کرتے ہیں اور عوام قبولیت عام کی سند پیش کر کے اس کی خداداد خوش مذاقی کی داد دیتے ہیں یہ سب اس لئے نہیں ہوتا کہ یورپ کے لوگ نیچر کو اپنا خدا مانتے ہیں یا یہ کہ ایشیا والوں کی طرح ان کے سینے محبت ربانی کے نور سے معمور نہیں ہوتے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دماغوں میں فطرت کا لفظ ان معانی کو اپنے بغل میں دبائے ہوئے نہیں داخل ہوگا جن معنوں کو لئے ہوئے وہ ہندوستانیوں کے

خیالات میں چلتا پھرتا ہے، یورپ والوں کی زبان سے نکلنے کے بعد یہ لفظ جسقدر وسیع اور رفیع الشان فضا پر حاوی ہو جاتا ہے ہندوستانیوں کی بولی میں وہ فضا اتنی ہی محدود اور پست ہو جاتی ہے،

نیچر یا فطرت جیسا کہ ہمنے اس مضمون میں اور ایک جگہ بیان کیا ہے۔ دو قسم کی ہوتی ہے، ایک تو وہ ہے جو اس نظر آنیوالی دنیا پر مشتمل ہے، جو ہمارے اطراف چاروں سمت پھیلی ہوی ہے، اور جو پہاڑوں، سمندروں اور آسمانوں کی دنیا کہلاتی ہے، اور دوسری وہ جو ہم میں سے ہر ایک کے دل کی ایک مخصوص خانگی دنیا سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی فطرت کے طرف بڑھنا چاہتا ہے تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک طرف تو بیرونی کائنات سے سرگرم گفتار ہونا اور اس کے گوناگوں معمول اور بھیدوں سے خبردار ہونا چاہتا ہے، اور دوسری طرف اپنے اندر کی اس عظیم الشان دنیا کی سیر و تفریح میں مشغول ہونا چاہتا ہے۔ جو اگرچہ خود ساختہ ہوتی ہے لیکن پہلی کائنات سے کسی امر میں کم نہیں ہوئی۔

بعض ادیب ایسے ہوتے ہیں۔ جو پہلی قسم کی فطرت کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے انھیں اس کی کامل ترجمانی کرنے میں قدرت حاصل ہوتی ہے، اور بعض ادیب ایسے ہوتے ہیں جو دوسری قسم کی فطرت پر اچھی طرح سے قابو حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن موخر الذکر فطرت کی ترجمانی بہ نسبت اول الذکر کی ترجمانی کے زیادہ آسان ہے اور اسی شاعر کی قدر و منزلت زیادہ ہوتی ہے۔ جو پہلی کی کامیاب ترجمانی کرتا ہے،

اگرچہ میر تقی میر کی شاعرانہ قوتوں کی حقیقی جولانگاہ، ایشیا کے اکثر شعراء کیطرح، دوسری قسم کی فطرت تھی لیکن کائناتی فطرت کی بھی انھوں نے جو تصویریں پیش کی ہیں وہ بھی ایک حد تک پاکیزہ اور دلچسپ ہیں، ان میں سے بعض یہاں تک مکمل ہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ میر خارجی فطرت کے اظہار میں بھی قادر الکلام تھے، نیز یہ کہ انہوں نے ضرور ان اشیاء اور واقعات کا گہرا مطالعہ کیا ہوگا جنکی وہ تصویریں کھینچ رہے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ مرغوں کی لڑائی کا سین کھینچتے ہیں تو ایسی ایسی پتہ کی باتیں بیان کرتے ہیں جو نفسیات کی رو سے بھی پوری اترتی ہیں، مرغوں کا لڑنا۔ ان کے مالکوں اور طرفداروں کا ان کی ہمدردی کے اظہار میں آپے سے باہر ہوکر عجیب عجیب حرکتیں کرنا، ان کی فتحمندی پر اظہار جوش و مدحت طرازی اور قسم قسم کی چیخ پکار، ان سب کا مکمل مرقعہ نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔

مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
اُن نے پر جھاڑے، یہ جھپڑکنے لگے — ان نے کی نوک یہ کڑانے لگے
وہ جو بیدا ہوا تو یہ ہیں کج — ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج
مرغ کی ایک پر فشانی ہے — ان کی تو رنگ بدزبانی ہے
ایک بولے کہ "کاری آئی چوٹ" — ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو چراتے ہیں — لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں
ایک کے منھ میں مرغ کی منقار — ایک کے لب پہ ناسزا گفتار

منھ پہ آیا جو کچھ سو بکنے لگا	تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگا
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے	بعد نصف النہار رخصت ہے

مرغوں کی لڑائی کے بعد کتوں کا ہنگامہ، میر صاحب کے خارجی بیانات میں زیادہ قابل ذکر ہے، میر کتوں سے بڑے بیزار ہو گئے تھے، کئی مثنویوں میں انہوں نے ان کی شکایت کی ہے کسی گاؤں میں پہونچتے ہیں تو وہاں کتے خوب ستاتے ہیں میر نے اسکا کیا ہی عمدہ مرقعہ پیش کیا ہے :-

کتوں کے چاروں اور رستے تھے	کتے ہی واں کہے تو بستے تھے
دو کہیں ہیں کھڑے، کہیں بیٹھے	چار لوگوں کے گھر میں ہیں پیٹھے
ایک نے پھوڑے باسن، ایکوں نے	کھو دمارے گھروں کے سب کونے
کوئی گھورا کرے، کوئی بھونکے	خفتہ خفتہ بھی شور سے چونکے
سانجھ ہوتے قیامت آئی اک	شور عف عف سے آفت آئی اک
گلہ گلہ گھروں میں پھرنے لگے	روٹی ٹکڑے کی بو پہ گرنے لگے
ایک نے آگے دیگچہ چاٹا	ایک آیا سو کھا گیا آٹا
ایک نے دوڑ کر دیا پھوڑا	پھر پیا آکے تیل، اگر چھوڑا
گھورنے اک لگا اندھیرا کر	ایک نے اور ایک پھیرا کر
گھر میں چھینکے اگر ہیں توڑ دئے	ہانڈی باسن گرا کے پھوڑ دئے
لوگ سوتے ہیں، کتے پھرتے ہیں	لڑتے ہیں، دوڑتے ہیں گرتے ہیں

جبکہ ہڈی پہ چار چار لڑیں | گوشت پر بھیڑیے سے دوڑ پڑیں
کتنے ہی واں جو چار رہتے ہیں | دو گئے بھی تو چار رہتے ہیں
جاگتے ہو تو دو بدو کتے | سو کر اٹھو تو روبرو کتے
منھ میں کف دور دور کرنے سے | حال ہے حال شور کرنے سے
کتوں کی کیا سماجتوں کو کہیں | بہ پھیڑی سے رات دن لگے ہی رہیں
باہر اندر کہاں کہاں کتے! | بام و در، چھت، جہاں تہاں کتے!!
جھڑ جھڑا دے ہے کان کو کوئی | رو دے ہے اپنی جان کو کوئی
یکطرف ہے چپڑ چپڑ کی صدا | یعنے کتا ہے پتلی چاٹ رہا
ایک چھینی کو منھ میں لے آیا | ایک چوٹے کا کھودتا پایا
ایک کے منھ میں ہانڈی ہی کالی | ایک نے چلپنی چاٹ ہے ڈالی
تیل کی کپی ایک لے بھاگا | ایک چھپنے گھڑے سے جا لاگا
آدمی کی معاش ہو کیونکر | کتوں میں بود و باش ہو کیونکر

ایک مثنوی میں اپنے گھر کا حال بیان کیا ہے، اور لکھتے ہیں کہ جب ان کے گھر کی ایک دیوار گر پڑی تو کتوں کے آنے جانے کے لئے کوئی روک ٹوک باقی نہ رہی اور وہ بے تکلف اپنا گھر سمجھکر آنے جانے لگے چنانچہ۔

دو طرف سے تھا کتوں کا رستا | کاش جنگل میں جا کے میں بستا
ہو گھڑی دو گھڑی تو دو دتکاروں | ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں

چار جاتے ہیں، چار آتے ہیں چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
کس سے کہتا پھروں یہ صحبت نغز کتوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز

اسی مثنوی میں جہاں کھٹملوں کا ذکر کیا ہے، غریبوں کی زندگی کا بعینہ نقشہ کھینچ دیا ہے کھٹمل جو غضب ڈھاتے ہیں اس کا بیان شاید ہی اس سے بڑھکر زیادہ مکمل کوئی اور پیش کرسکے، ایک تو میر کی طبیعت ہی فسردہ تھی اور دوسرے یہ انکا ذاتی تجربہ تھا بھلا کیونکر بیان مکمل نہوتا :-

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا
ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں
ہاتھ تکیے پر گہ بچھونے پر کبھو چادر کے کونے کونے پر
سلسلایا جو پائنتی کے اور وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور
تو شک ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹی ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی
جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان ساری کھاٹوں کی چولیں نکلی ندان
نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو پائے پٹی لگائے کونے کو
جب نہ تب پنڈے پر لئے پائے سیتلا کے سے دانے مرجھائے
سوتے تنہا نہ بان میں کھٹمل آنکھ منھ، ناک، کان میں کھٹمل
اک ہتیلی میں، ایک گھائی میں سیکڑوں ایک چارپائی میں
ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کھٹے کبتلک یوں ٹٹولتے رہئے

ایک جگہ میر تقی بہت ہی شگفتہ ہو گئے ہیں، اور آمد بہار سے متاثر ہو کر شراب طلب کرنے لگتے ہیں وہ اس موقعہ پر اس جوش و خوش آہنگی کے ساتھ نعرے لگاتے ہیں کہ مرزا غالب کی بھی احتجاجی صدائیں، شراب کے لئے اتنی بلند نہیں اُٹھتی تھیں، اسی حالت میں انہوں نے چمن کی شادابی اور بادبہاری کی عیسیٰ نفسی کے نہایت لطیف نمونے پیش کئے ہیں فرماتے ہیں:۔

آئی ہے بہار مے گسارا ں
پھولے ہیں چمن میں گل ہزاراں

آئی ہے بہار دہر خیاباں
ہے لطف ہوا سے گل بداماں

آئی ہے بہار دیدہ گیتاں
ہے توبۂ بادہ دل پریشاں

آئی ہے بہار مرغ گلزار
کرتا ہے نوائے سینہ افگار

ساقی جو کروں میں مے ادائی
معذور رکھ اب بہار آئی

گل باد صبا کے تاکمر ہے
داماں بلند ابر تر ہے

ظالم مے ناب دے ہوا ہے
اک جرعہ شراب کے ڈھوا ہے

ہر سر میں ہے شور فصل دے کا
چھلکے ہے ہوا سے رنگ مے کا

اطراف چمن کھلا ہے لالہ
ہر پھول شراب کا ہے پیالہ

آتا ہے چمن پہ ابر جوشاں
آب رخ کار سبز پوشاں

تحریک نسیم دم بدم ہے
تکلیف ہوائے گل ستم ہے

ابروں نے بھی کی ہے مے پرستی
اٹھتے ہیں بعد سیاہ مستی

بوندوں کا ہر رنگ سا ہے چھمکا
رنگِ گل لالہ زور چمکا ہے
ہے گل کی ہوا سبو کشی میں
بلبل کا دماغ بو کشی میں
ہر شاخ ہے شورِ جام در دست
نرگس ہے کسو کی نرگس مست
ہے رنگ ہوا کا آفتابی
جھومے ہیں نہال جو شرابی
ہیں سرو جواں نشہ در سر
لوٹے ہے روش پہ سبزۂ تر
چشمک کرے ہے حباب جو کا
یعنے کہ ہے دور اب سبو کا
ساقی تدحے کہ ذوقِ مل ہے
مطرب غزلے کہ فصل گل ہے

اس کے بعد ایک بہاریہ غزل سنائی جاتی ہے اور اسی سلسلہ میں ان کے وہ اشعار آتے ہیں جو انہوں نے شراب پر لکھے ہیں، ان اشعار میں شراب کے تقریباً ہر متعلقہ پہلو پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہتے ہیں :-

وہ دارُوئے دردِ بے حضوراں
وہ مایہ نورِ چشم کوراں
سرمایۂ عمر جاودانی
یعنے وہ ہے اب زندگانی
وہ میوہ خوش رسیدہ بارے
وہ عیش دل گزیدہ بارے
آئینۂ حسن خود پسنداں
زینت وہ عنبرین کمنداں
وہ رنگ رخ بہار یعنے
وہ بادۂ خوشگوار یعنے
وہ کام دل سبو بدوشاں
یعنے کہ وہ ہے شراب جوشاں
وہ موجب دل خوشی کہاں ہے
وہ دارُوئے بے ہشی کہاں ہے

وہ جسکی طرف کو ہے تہِ دل — یعنے وہ ہے شیشہ ماہ منزل
وہ آتش تیز آب آمیز — وہ عربدہ جو وہ فتنہ انگیز
وہ مقصدِ جانِ ناامیداں — وہ روسیہی رو سفیداں
وہ رونق کارگاہ شیشہ — وہ شوکت بارگاہِ شیشہ
وہ جس سے ہی تو مو پریشاں — وہ جس سے ہو گفتگو پریشاں
وہ دامن خشک جس سے جل جائے — ثابت قدموں کا پاتو چل جائے
وہ سرخی چشم خوبرویاں — اسباب خرابی نکویاں
وہ دلبر خود سرو شلائیں — وہ رہزن راہِ دین و آئیں
وہ جس سے غبار دل سے دھوویں — مینا کے گلے سے لگ کے روویں

انسانی اور کائناتی فطرت کے اکثر مرقعوں کی مثالیں، گذشتہ بیانوں میں اور خصوصاً دوسری قسم کی مثنویوں کے ضمن میں کثرت سے آچکی ہیں، یہاں انکا دہرانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن ایک امر جسکا ذکر ضروری ہے وہ میر تقی کے سراپا ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شاعری میں اچھے سے اچھے سراپا کثرت سے موجود ہیں۔ مگر میر نے جو سراپا پیش کئے ہیں وہ اسلئے خاص طور پر قابل توجہ ہیں کہ وہ اردو کے اولین سراپاؤں میں داخل ہیں اور باوجود اس کے کہ اس زمانے تک اردو زبان (اور بالخصوص مثنوی کی زبان) ابھی پوری طرح سنبھلنے نہیں پائی تھی تاہم میر کے سراپا خاص طور پر دلچسپ ہیں، حسب ذیل تصویر کسقدر عمدہ اور مکمل ہے!!

قدوقامت اسکا کروں کیا بیاں — قیامت کا ٹکڑا ہوا تھا عیاں
وہ نازاں جدھر آتی تھی اچپلی — قیامت بھی آتی جلو میں چلی
شکن اس کی کاکل کا دامِ بلا — ہر ایک حلقۂ زلف کامِ بلا
بھووں کی کمانوں سے آنکھ لڑتا — ادا لُٹتے تھے اڑ اڑ کے جوں تیر پا
اگر ابرو اس کی جھک جاتی تھی — مہِ نو کی گردن ڈھلک جاتی تھی
نگہ دار تھی سرخی چشم کی — طرفدار تھی اپنے ہی خشم کی
پری منفعل رنگ رخسار سے — خجل کبک انداز رفتار سے
لب سرخ اسکے وہ گلبرگ تر — نہ چھپتی تھی جن میں دندان کی سلک گہر
تبسم میں اپنے وہ برق بہار — دم حرف ہوتے گئے آبدار
دہن غنچۂ ناشگفتہ سے کم — سخن رہرو راہِ تنگ عدم
تبسم تنک گر وہ دلکش کرے — تو گلشن میں گل صد چمن غش کرے
نہ دیکھا کسی نے جو تن اسکا صاف — نظر گر نہ ٹھہرے تو کیجئے معاف
کمر اس کی ممکن نہیں ہاتھ آئے — مگر صاحب دست غیب اسکو پائے

(الاختصر)

(۹)

میر کی تمام مثنویاں اُن کی عمر کے کسی مخصوص زمانے کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ وہ اُنکی طفولیت سے لیکر بڑھاپے تک کی ساری زندگی پر حاوی ہیں۔ اور ان میں ایک تحیر خیز یکسانیت نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ایک ہی دماغ کی تخلیق اور ایک ہی شخصیت کے مظاہر ہیں۔ ان کے گہرے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہونچتے ہیں کہ ہر ایک مثنوی میں ایک ہی قلب و دماغ رکھنے والی ہستی اپنی ذات کو مضمر کئے ہوئے ہے، لیکن اگر کسی مثنوی میں ان کی حیات کا ایک پہلو نظر آتا ہے تو کسی میں دوسرا، کسی میں ان کی جوانی کی جوشیلی طبیعت انہیں اتیزی کے ساتھ عشق و محبت کی ترجمانی پر مجبور کرتی ہے تو کسی میں ان کی طویل عمری اور قنوطیت، ان کے جذبیلے قلم کو ذرا سُست کر دیتی ہے لیکن ساتھ ہی انکی قادر الکلامی اور پختہ مزاجی اس فقدان جوش و خروش کی تلافی بھی کر دیتی ہے۔

اُن کی بعض مثنویوں کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ذاتی رہبری اور عبرت آموزی انسان کو کیا کیا سکھا سکتی ہے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ انسانی کائنات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کسی کی انفرادیت پر کس قسم کا اور کس حد تک اثر پڑ سکتا ہے گو میر تقی اپنی شاعری میں ان عورتوں اور مردوں کے کردار اور زندگیوں کو پیش کرنیکا دعویٰ نہیں کیا۔ جن میں ان کی زندگی بسر ہوئی تھی، نہ ان کی مثنویاں اس قصد سے لکھی گئی تھیں، لیکن وہ ضرور ہمیں مطلع کرتی ہیں کہ کوئی شخص ان میں کس قسم کے

نقوش تاثر اپنے دل و دماغ پر ثبت کر سکتا ہے اور کسی کا ماحول اس کے کردار کی تخلیق میں کہاں تک اس کی مدد کیا کرتا ہے۔

اگر ہم میر کی شاعری کو حقیقی طور پر سمجھنا، اور ان کی مثنویوں سے اچھے طرح متکیف ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ انھیں ایک ایسا متمول اور متکبر انسان تصور نہ کریں جو کسی بڑے شہر کے ایک عظیم الشان محل میں، زرق برق لباس، سونے چاندی کے ظروف اور قیمتی ساز و سامان کے ساتھ، عیش و عشرت میں زندگی بسر کر رہا ہو بلکہ ایک ایسا خود دار اور مستغنی مزاج شریف آدمی جو کسی اجاڑ محلہ کے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں اپنی درد آشنا زندگی کے طویل ایام غربت کے ساتھ گذار رہا ہو۔ اور آئے دن ایک نت نیا سانحہ بلا کی صورت میں نازل ہو کر قنوطیت کے ان بادلوں میں جو اس کی افسردہ طبیعت پر ہر وقت چھائے رہتے ہیں، ایک قیامت خیز اضافہ کرتے رہتا ہو، اور ان اضافوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہو جبکہ اس کی نازک دماغ شخصیت اور ہمیشہ لرزتے رہنے والا قلب رکھنے والی ہستی اپنی پژمردہ زندگی کے ایک سو سال ختم کرنے کے بعد اس دنیائے فانی سے کوچ کر جاتی ہے۔

میر انیس
اور
اُن کی شاعری

(۱)

جو لوگ مذہبی احساسات کی پروا نہیں کرتے ہرگز کامیاب صناع ممتاز شاعر اور سوسائٹی کے فتحمند رکن نہیں بن سکتے، میر انیس کی عظیم الشان شخصیت اور ان کی شاعری کے قدر و منزلت کا اندازہ کرتے وقت سب سے پہلے جو خیال ہمارے دماغ میں موجزن ہوتا ہے وہ یہی ہے جس کو یورپ کے ایک مشہور ماہر اخلاق نے کامیاب زندگی بسر کرنے کے اصول بیان کرتے ہوے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ پیش کیا تھا۔

ہندوستان کے کسی شاعر کو اپنی زندگی ہی میں اس درجہ قبولیت عامہ اور قدر و منزلت نصیب نہیں ہوی میر انیس کا کلام نہ صرف ان کی زبان سے سُننے کے بعد ہی عوام میں مقبول ہوا کیا بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہر سال مرثیہ خوانی کے ذریعہ گویا میر انیس کا احیا ہوتا ہے اُن کا کلام اب بھی اُسی جوش و خروش کے ساتھ سنا جاتا ہے مسلمانوں کا ایک زبردست فرقہ اس کا پڑھنا اور پڑھانا باعث نجات و ثواب آخرت سمجھتا ہے اگر قرآن شریف کے بعد آل نبیؐ کے راسخ الاعتقاد شیدائیوں اور پنجتن پاکؑ کے پُرجوش فدائیوں کے نزدیک کوئی کتاب قابل حرمت ہے اور زیادہ پڑھے جانے کے قابل، تو وہ صرف مجموعۂ مراثی، جن میں میر انیس کا کلام سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

اگرچہ مرثیہ گوئی کے طفیل میں شاعروں کو ہزار ہا روپئے ہر سال نصیب ہوتے رہتے ہیں لیکن میر انیس کا مطمح نظر صرف شہرت اور دولت کمانا ہی نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہ اہل بیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا خوانی اور حضرات شہدائے کربلا علیہم السلام کی عزاداری اپنا فرض سمجھتے رہے اور اس بارے میں وہ اس حد کو پہنچ گئے تھے کہ دنیاوی حکمران اور صاحب مقدرت ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے، چنانچہ جس کے ملک میں پرورش پاتے ہیں اس کے روبرو بھی پہلے اس کی تعریف کرنے کے بغیر (جس طرح دبیر نے کیا تھا) حضرت علیؑ کی منقبت شروع کر دیتے ہیں اور نہایت فخر سے کہتے ہیں ؎

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر — مدعی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

ان کے اکثر مرثیے گواہی دیتے ہیں کہ انھیں ان کے ذریعہ کئی کئی سعادتیں حاصل ہونے کی امیدیں ہیں، اگر کوئی مرثیہ بہت ہی اچھا پڑھا جائے تو وہ اس کو اپنے کمال پر محمول نہیں کرتے بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت امامؑ کی تائید کے بغیر مرثیہ اس طرح نہیں پڑھا جا سکتا چنانچہ کہتے ہیں ؎

یہ بزم اور یہ آج کا پڑھنا ہے یادگار — رعشہ ہے دست و پا میں لرزتا ہے جسم زار
وہ یوں پڑھے جسے نہ ہو طاقت کلام کی — تائید ہے حسین علیہ السلام کی

(مرثیہ (۱۷) جلد اول نظامی پریس صفحہ ۳۸۹)

بعض دفعہ وہ کوئی اچھا مرثیہ لکھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ مرثیہ نہ صرف دنیا والوں ہی کو پسند آیا ہے بلکہ ؎

فرما رہے ہیں شیر خدا مرحبا تجھے — دیتی ہے روح فاطمہ زہرا دعا تجھے

(مرثیہ (۱۴) صفحہ ۳۱۶)

اگر کبھی ان کے کمال کی تعریف نہ بھی کی جائے یا خاطر خواہ قدر دانی نہ ہو تو انھیں کوئی پروا نہیں کیونکہ انھیں یقین ہے کہ اس کی جزا اہل بیت نبی سے ملے گی چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

خاموش انیس اب کہ تڑپتا ہے دل زار کافی ہے رلانے کو تری درد کی گفتار
اس جنس کا گر آج نہیں کوئی خریدار فیاض ہے لیکن شہ مظلوم کی سرکار
افسردہ نہ ہو غنچۂ امید کھلے گا
کھل جائیں گی وہ صلہ تجھ کو ملے گا (مرثیہ (۸) صفحہ ۱۶۹)

کسی وقت جب ان کو اپنے ہم عصر مرثیہ گویوں کے حسد سے تکلیف ہوتی ہے تو وہ بڑے فخر سے دعویٰ کرتے ہیں کہ مداحی شہ لولاک صرف میرا ہی حق ہے اوروں کو یہ سعادت بجا طور پر نصیب نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں ساتویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ایک مرثیہ کے آخر میں لکھتے ہیں ؎

خاموش انیس اب کہ ہے سینہ میں جگر چاک حق ہے ترا مداحی سبط شہ لولاک
حاسد سے نہ کچھ خوف نہ دشمن سے ہے کچھ باک نافہم ہے وہ چاند پہ ڈالے جو کوئی خاک
سب مدح کریں نظم کی یہ نظم و نسق ہے
باطل ہے وہ باطل ہے جو حق سے وہ حق ہے (مرثیہ ۲۱ صفحہ ۴۶۴)

انھیں اپنی مرثیہ گوئی کے صلہ میں ایک طرف تو زیارت کربلائے معلیٰ سے مشرف ہونے کا شوق ہے اور دوسری طرف آخرت میں نجات پانے کی امید چنانچہ اکثر مرثیوں کے آخر میں اس قسم کے دعائیہ بند لکھے ہیں ؎

بس اے انیس بزم میں ہے گریہ و بکا وقت دعا ہے خالق اکبر سے کر دعا

یارب بحق احمدؐ و زہرا و مجتبیٰ دکھلا دے مجھ کو روضۂ سلطانِ کربلا

دم لب پہ ہے زیارتِ مولیٰ نصیب ہو

بیمارِ غم کو قربِ مسیحا نصیب ہو (مرثیہ ۲۲ صفحہ ۴۸۸)

خاموش انیسؔ آ گئے نہیں طاقت تحریر عالم جسے روتا ہے وہ مظلوم ہے شبیر

خالق سے دعا مانگ کے اے خالقِ تقدیر دکھلا مجھے آنکھوں سے مزارِ شہِ دلگیر

محسوب ہوں زوارِ امامِ دوسرا میں

مر جاؤں تو مدفن ہو جوارِ شہدا میں (مرثیہ ۱۸ صفحہ ۴۱۴)

آقا انیسؔ ہند میں کب تک پھرے تباہ گھٹتی ہے عمر بڑھتے چلے جاتے ہیں گناہ

ضعف اس برس بہت ہے اجل آ نہ جائے آہ بلوائیے غلام کو اے میرے بادشاہ

قربِ مزارِ شاہِ دو عالم نصیب ہو

بس کربلا میں اب کی محرم نصیب ہو (مرثیہ ۱۳ صفحہ ۲۹۴)

بلواؤ خاکسار کو یا ابن بوتراب! ڈر ہے کہ ہند میں مری مٹی نہ ہو خراب

جلوہ ہے قبر پہ مولیٰ کے نور کا

خاکِ شفا میں قبر ہو صدقہ حضور کا (مرثیہ ۱۰ صفحہ ۲۱۸)

مولا ضریحِ پاک پہ بلوائیے شتاب اب ہجر کی انیسؔ کے دل کو نہیں ہے تاب

رہ جائیگی ہوس جو دیا زیست نے جواب خاکِ شفا ملے مجھے یا ابن بوتراب

اچھی نہیں مریض کو دوری مسیح سے

حسرت یہ ہے کہ روؤں لپٹ کر ضریح سے (مرثیہ ۴ صفحہ ۷۴)

خاموش اے انیسؔ جگر ہو گیا دو نیم کام آئے گی یہ مدح بروزِ امید و بیم

عسرت کا غم نہ کھا کہ ہے آقا ترا کریم   اب جلد یاں سے روضۂ سرور پہ ہو مقیم
حاصل حضوری شہ گردوں اساس ہو
ہے وہ غلام خاص جو آقا کے پاس ہو   (مرثیہ ۲۰ صفحہ ۴۴۹)

اور صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ تمام مومنین اور عزاداران شہ دین کے لئے بھی وہ یہی چاہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ

زندہ رہیں دنیا میں شہ دیں کے عزادار   غیر از غم شہ ان کو نہ غم ہو کوئی زنہار
آنکھوں سے مزار شہ دلگیر کو دیکھیں
اس سال ہیں سب روضۂ شبیر کو دیکھیں   (مرثیہ ۲ صفحہ ۳۰)

(۲)

مرثیوں نے ہندوستان کے شیعہ فرقہ میں از سر نو جان ڈال دی، اور نہ صرف شیعہ بلکہ وہ اہل سنت والجماعت بھی جو مجالس عزا میں شریک ہوتے تھے ان ساختہ یا مصنوعی روایتوں کو بالکل سچ سمجھنے لگے جو مرثیوں میں بیاں کی جاتی تھیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ میر انیس نے بھی بعض جگہ بالکل غلط اور اکثر دفعہ مبالغہ کے ساتھ واقعات کی تخلیق کی ہے اور یہ مذہبی نقطہ نظر سے ایک معیوب سی بات نظر آتی ہے لیکن اگر شاعری اور تخلیق کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ان کے یہ کارنامے نہایت قابل قدر ثابت ہوتے ہیں اور اپنے صناع کی وسعت تخیل اور وجدان صحیح کی داد لئے بغیر نہیں رہتے۔

شاعر کی صناعیوں کو مذہبی عینک سے دیکھنا اس کی شعری اور تخلیقی خوبیوں کا خون کرنا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی کارنامہ کو ادبیات عالیہ میں داخل کرنے کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ اس کا موضوع اعلیٰ ہو اس کا صداقت پر مبنی ہونا بھی لازمی ہے لیکن اگر کسی کا

موضوع اعلیٰ ہے اور وہ کسی موجودہ صداقت کی نقل نہیں ہے بلکہ اس میں جو صداقت پائی جاتی ہے وہ خود شاعر کی ذہنیاتی تخلیق ہے تو اس قسم کا کارنامہ اور بھی زیادہ قابل قعت ہوگا کیونکہ کسی چیز کی بعینہٖ نقل یا کسی واقعہ کی ہوبہو تصویر پیش کر دینے سے اُسی قسم کی ایک نئی تخلیق زیادہ شاندار اور ساتھ ہی دشوار گزار امر ہے۔ میرانیس اگر کربلا کے دردانگیز واقعات کی ہوبہو نقل اُتار دیتے تو ان کا کلام صرف ایک مذہبی یا تاریخی کتاب کی حیثیت میں منحصر رہتا اور وہ غیر محدود شہرت و عظمت جو آج ان کی شخصیت اور شاعری کی دامنگیر ہے ہرگز نصیب نہ ہوتی۔

یہی وجہ تھی کہ انھوں نے عربی طرز معاشرت کی جگہ ہندوستانی طرز معاشرت کے خاکہ میں اپنے عرب رجال داستان کو متحرک کیا، اگر انیس اپنے مرثیوں میں عربی طرز معاشرت کی وفاداری کے ساتھ ترجمانی کرتے تو انھیں ہرگز کامیابی اور قبولیت عام حاصل نہ ہوتی اور نہ صرف یہی بلکہ وہ ادیب کامل اور اعلیٰ صناع ہونے سے بھی محروم رہ جاتے۔

ایک زبردست انشا پرداز کو اپنی تخلیق میں ضرور اس امر کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ وہ اس کے ماحول کے بالکل مناسب ہو جائے، دنیا کے تمام خدایان سخن یہی کرتے آئے ہیں کیونکہ وہی تصنیف اعلیٰ ہوتی ہے جو اپنے زمانہ اور ماحول کی خالص پیداوار ہوتی ہے، ہندوستان میں عربی آئین و رسوم کو شدت صداقت کے ساتھ پیش کرنا کیا چین میں عبرانی بائبل شائع کرنے سے کچھ کم تھا؟ اور پھر یہ کوئی بڑے کمال کی بات بھی نہیں۔ اعلیٰ صناع تو وہ ہے جو اپنی مخلوق کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس کے مخاطب اس کو اپنے ہی میں کا ایک زندہ شخص تصور کرنے لگیں اور اس کے حالات زندگی سے ویسے ہی متاثر ہوں جیسے کہ خود ان کے خاندان کے کسی فرد کے زوال یا عروج کے وقت وہ متاثر ہوتے ہیں۔

انیس نے گنگا جمن کے مرغزاروں میں رنگ رلیاں منانے والوں کے آگے ویسی ہی مخلوق نہیں پیش کردی جو خود بھی عیش و عشرت میں سرمست اور بیہودگیوں میں سرشار ہو بلکہ انھوں نے ایسی ہستیاں پیش کیں جو صورت شکل بات چیت ہنسنے بولنے اور چلنے پھرنے میں تو بعینہٖ انہی لوگوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں لیکن جن کی ذہنیاتی فضا اور قلبی کیفیات بالکل دگرگوں تھیں اور جن کی سیرتوں کے ذریعہ مخاطبوں کے قلوب اور ذہنیتوں میں ایک تحیر خیز انقلاب پیدا کیا جا سکتا تھا چنانچہ ہوا بھی یہی، انطباقی کیفیت اس درجہ کو پہنچ گئی کہ آج کل جہاں کسی کی زبان سے حضرت عباس، حضرت علی اکبر، حضرت زینب، یا حضرت صغریٰ کے متعلق کوئی شعر نکل پڑتا ہے تو سننے والا اس کو بالکل اپنے ہی گھرانے کے بزرگوں سے متعلقہ واقعہ سمجھ کر اس سے متکیف اور متاثر ہوتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں انیس کی تخلیقی عظمت کمال کو پہنچ جاتی ہے۔

اسی طرح اس میں کوئی شک نہیں کہ میر انیس نے عام مرثیہ گویوں کی طرح غلط بیانی اور مبالغہ سے جا بجا کام لیا ہے لیکن کیا یہ ان کی زبردست صنّاعی کی دلیل نہیں ہے کہ انھوں نے جو کچھ پیش کیا وہ اس شائستگی سے پیش کیا کہ تمام لوگ اس کو سچ ماننے لگے اور اس پر ایسا ہی یقین کرنے لگے جیسا کہ حدیث اور تاریخ کی صحیح و ثقہ کتابوں پر یقین کرتے ہیں؟

ان تمام مذہبی اعتراضات کے باوجود کوئی ذوق سلیم رکھنے والا ان حقیقتوں سے انکار نہیں کر سکتا کہ انیس کے کلام کا مطالعہ ہمارے خیالات میں اسلامیت کو موجزن کر دیتا ہے، ہمارے صداقت پرستی کے جذبات کو برہما دیتا ہے، ہمارے قلوب کو احسان و مہمان نوازی کی طرف مائل کرتا ہے اور ہمارے احساسات میں نیک دلی و مروت کوٹ کوٹ کر بھر دیتا ہے۔

انیس نے نہ صرف ہمارے خیالات میں مذہبی تخم بو دیے بلکہ ہماری زبان اور نفطیات میں بھی

مذہب سے متعلقہ الفاظ کا ایک گرانبہا اضافہ کیا مثلاً خدائے تعالیٰ، رسول پاک اور حضرت امام حسینؑ کے لئے اس قسم کے بیسیوں نام اختیار کئے۔

خدائے تعالیٰ = خالق اکبر، خالق تقدیر، خداوند دو جہاں، خدائے پاک، خدائے جلیل، ایزد غفار، ربّ عادل، رب عباد، صاحب جود، ذوالجلال، ذوالمنن، معبود کردگار وغیرہ

رسول پاکؐ = سلطان کائنات، شہنشاہ مشرقین، شاہ انس و جاں، شاہ بحر و بر، شاہ نیک خو، شاہ کائنات، بادشاہ کون و مکاں، شہ ابرار، شہ لولاک، شہ اُمم، سیّد البشر، سید اُمم، محبوب ذوالمنن، محبوب ذوالجلال، محبوب کبریا، محبوب کردگار، محبوب حق، سرور زمن، سرور عرب، رسول حق، رسول عربی، رسول فلک حشم، رسالت پناہ، رسالت مآب، مختار کائنات، مالک الرقاب وغیرہ

حضرت امام حسینؑ = شاہ، شاہ نامدار، شاہ خوش خصال، شاہ ارجمند، شاہ فلک وقار، شاہ بحر و بر، شاہ دیں، شاہ فلک سریر، شاہ خوش اوقات، شہ ابرار، شہ عالی، شہ ذیجاہ، شہ عادل، شہ عالم، شہ اُمم، شہ حجاز، بادشاہ عرش نشیں، شہنشاہ سربلند، شہنشاہ جزو کل، شہنشاہ سرفراز، مختار کائنات، مختار تاج و تخت، مختار خشک و تر، خسرو زمیں، دوعالم کا تاجدار، قبلۂ انام، قبلۂ عالم، سرور عالم، سرور عالی، سیّد والا، امام اُمم، امام دہر، مہر امامت، خورشید دیں، دُرِ نجف، نیر دیں، نوح غریباں، چشمۂ فیض غفار، قمر آسمان دیں، بحر فیض، آسمان جناب، عرش بارگاہ، سبط نبی، سبط پیمبر، سبط رسالت مآب، پسر سید البشر، گل ریاض محمدؐ، جگر و جان رسول مختار، فرزند پیمبر، نور چشم علی، ابن مرتضیٰ، علی کا لعل، پسر مصحف ناطق، حیدر کا جانشین، دلبر زہرا، حضرت خیر النسا کا ماہ، زہرا کا یادگار، شمع قبر رسالت پناہ، وغیرہ

(۳)

انیس کے کلام کے مذہبی عنصر کو قطع نظر کر کے جب ہم اُس کے ادبی پہلو کی طرف مائل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے اُس کے رجال داستان ہمارے قلوب کو ایک مضمر لگاوٹ کے ساتھ کھینچتے نظر آتے ہیں

کسی ادبی کارنامے کی تکمیل کے واسطے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ موضوع کے لئے

کائنات اور فطرت کے ان پہلوؤں کا انتخاب کیا جائے جو صداقت معنوی اور حسن ظاہری دونوں کے لحاظ سے انسانی ذہنیات کو متاثر کر سکتے ہوں کسی تخلیقی شہ کارے کی خوبی داخلی حیثیت سے تو یہ ہے کہ وہ اپنے مطالب و معانی کے ذریعہ دامن دماغ کو سرور و انبساط سے بھر دے اور خارجی حیثیت سے یہ کہ ہماری نگاہوں کے آگے تصنیف کی ظاہری شکل کو مجموعی حیثیت اور پھر اس کے خاص خاص حصوں کو انفرادی طور پر نہایت ہی حسین شکل میں پیش کرے[1]، اس طرح ایک زبردست صناع کو انتخاب مضمون اور ذریعہ اظہار دونو قسم کی جکڑبندیوں میں رہ کر کام کرنا ضروری ہوتا ہے اور جس کارنامہ میں ان دونو کا خاطر خواہ لحاظ رکھا گیا ہو وہی ایک کامیاب شہ کارہ ہے۔

"انتخاب مضمون میں اس امر کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ جو (شے) ظاہری طور پر بدنما اور بے ڈھب ہوتی ہے وہ ادب عالی کا موضوع ہرگز نہیں بن سکتی، لیکن مصنف کو چاہئے کہ صرف اظہار حسن کی خاطر صداقت کو ملیا میٹ نہ کر دے، مصنوعات عالیہ ان تمام اشیا پر مبنی ہوتی ہیں جو درحقیقت حسین ہوتی ہیں اور ناقص ادب وہ ہے جو ان چیزوں کو جو دراصل حسین نہیں ہوتیں حسین بنانے کی کوشش کرتا ہے[2]"

جب ہم متذکرہ بالا اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے انیس کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہر حیثیت سے اس قدر رفیع الشان ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی (اس قبیل کا) اور کارنامہ اس کی برابری کو نہیں پہنچ سکتا دنیا کی اور زبانوں کی عظیم الشان نظمیں جن کی زبان اور خیالات نے اپنے اپنے ملک و قوم کی ذہنیت اور اخلاق و عادات کی اصلاح کی حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ایلیڈ (۲) ای نیڈ (۳) مہابھارت (۴) رامائن (۵) پیراڈائس لاسٹ (۶) شکسپیر کے بعض ڈرامے (۷) شاہنامہ۔ گو ان تمام کے مصنفین زندہ جاوید فلسفی، ممتاز شاعر اور بلند خیال معلم اخلاق معلوم ہوتے ہیں، ان کے دماغوں کی ساخت میں بھی یکسانیت نمایاں ہے "اور انھیں زبان پر ایسی قدرت اور ان کے خیالات میں اس درجہ وسعت نظر آتی کہ ان کا کلام انسانی طاقت سے باہر نظر آتا ہے[3]"

[1] روح تنقید [2] روح تنقید صفحہ ۱۱۷ [3] رسالہ سہیل صفحہ ۵۶۔

لیکن ان سب شعرا کا وزن بظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے مراثی انیس کو فوقیت حاصل ہے۔
ہومر کی الیڈ میں (۱۶) سولہ ہزار، ورجل کی ای نیڈ میں دس ہزار، والمیکی کی رامائن میں (۴۸) اڑتالیس ہزار، اور فردوسی کے شاہنامہ میں (۶۰) ساٹھ ہزار شعر سے زائد نہیں برخلاف اس کے میر انیس کا کلام اسی نوے ہزار اشعار پر مبنی ہے۔

ایلیڈ، ای نیڈ اور مہابھارت کے رجال داستان پر عظمت شخصیتیں نہیں ہیں ان کی ذاتی خوبیاں اس درجہ کی نہیں کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلیں" نیز مہابھارت کسی خاص فکر کا نتیجہ نہیں، اس کی تہذیب و ترتیب میں متعدد دماغ لگے ہیں اور صدیوں کی کوشش و کاوش کے بعد اس درجہ تک پہنچی ہے" پیراڈائس لاسٹ کا موضوع مہتم بالشان نہیں شکسپیر کے ڈراموں اور فردوسی کے شاہنامے کے موضوع بے حد وسیع ہیں اور ان میں اس قدر متفرق ہستیاں کام کرتی نظر آتی ہیں کہ پڑھنے والا کسی ایک ہی شخص کے ساتھ کامل ہمدردی نہیں پیدا کرسکتا، اس میں کوئی شک نہیں کہ رامائن کا موضوع اعلیٰ ہے اس نے ہندوستانیوں کے ادب و اخلاق کی درستگی میں زبردست حصہ لیا ہے اور اس کے رجال داستان بھی نہایت عظمت مآب شخصیتیں ہیں لیکن وہ ایک طربیہ ہے اور طربیہ حزنیہ سے بہت کم درجہ کا کارنامہ ہوتا ہے

انیس کے کارنامے میں اصلی شخصیت اور سب سے زیادہ قابل عظمت ہستی حضرت امام حسینؑ کی ہے آپ کا سراپا جا بجا پیش کیا گیا ہے انیس کے کلام میں آپ کی سیرت کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے دماغ میں ایک ایسی مقدس ہستی کا تصور قائم ہوجاتا ہے جو بچپن ہی سے نیک صورت اور نیک سیرت ہے جس کے گھر والے دین و دنیا دونوں جگہ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، جس کے خاندان میں مذہبی عظمت کے علاوہ دنیا کی امانت بھی موجود ہے، جس کا بچپن صداقت اور محبت کے گہواروں میں بسر ہوا ہو، جس کی جوانی تبلیغ و جہاد کے دلچسپ بازی گاہوں میں شہسوارانہ کرتب دکھلاتے ہوئے گزر گئی ہے اور جس نے اپنی عمر کا آخری حصہ اپنے خاندان کی لاج رکھنے، اپنے نانا کی امت کی دلجوئی تعلیم اور اصلاح کے خیال سے اور اپنے والد کے ساتھیوں کی

اور ۲ و ۵ رسالہ سہیل صفحہ ۵۵ باب جنوری ۱۹۲۶ء ۱۲

امداد کے لئے سخت جفاکشی میں گزار دیا ہے اور پایانِ کار صرف صداقت کی خاطر اس وقت جب کہ دنیا میں اس کا کوئی یار و مددگار اور مونس و غمخوار نہ تھا اور اس موقعہ پر جب کہ عام طور پر بڑے بڑے رستم دل سورماؤں کے بھی پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں سخت سے سخت تکلیفیں اٹھاتے ہوئے اپنی جان پر سے کھیل جاتا ہے۔

یہاں ہم آپ کے سراپا کے متعلق انیس کے متفرق مرثیوں سے بعض بعض بیانات اخذ کر کے پیش کرتے ہیں وہ لکھتا ہے:۔

آپ[1] کا چہرہ آفتاب سے زیادہ روشن تھا، آپ کے گیسو نہایت کالے اور لانبے لانبے تھے ان گیسوؤں میں چہرہ ایسا نظر آتا تھا جیسا ہالے میں چاند دکھائی دیتا ہے، آپ کے ابرو ماہ نو سے زیادہ خوبصورت تھے آنکھیں ہرن کی آنکھوں کو شرمندہ کرتی تھیں داڑھی پر خضاب لگایا کرتے تھے، آپ رسول پاکؐ کے بالکل مشابہ تھے جب آپ جنگ کے لئے کھڑے رہتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ع گویا کھڑے ہیں جنگ کو محبوب کردگار۔ اور آپ کے رخ سے "دبدبۂ شاہ ذوالفقار" عیاں رہتا تھا۔

آپ سے آنحضرتؐ کو بہت محبت تھی، انھوں نے آپ کے بچپن ہی میں آپ کی شہادت کی خبر سنادی تھی ایک دفعہ آپ اور امام حسنؑ کھیلتے کھیلتے مسجد میں سرورِ زمنؐ کے پاس پہنچتے ہیں، نانا بڑے بھائی کا منہ اور آپ کا گلا چومتے ہیں تو آپ کو برا معلوم ہوتا ہے آپ خشمگیں ہو کر آنکھوں پر آستیں رکھے تیوری چڑھائے اور سر کو جھکائے ہوئے گھر چلے آتے ہیں اور گھر میں آنے کے بعد کرتے کو منہ پر رکھ کر زار زار رونے لگتے ہیں جب آپ کی والدہ آپ کی سب سے زیادہ چاہنے والی، زہراؑ سبب دریافت کرتی ہوئی فرماتی ہیں

واری اگر حسنؑ نے رلایا برا کیا ۔۔۔ پوچھوں گی کیا نہیں مرے پیارے نے کیا کیا؟
تو بولے حسینؑ ہم تو ہیں اس بات پر خفا ۔۔۔ نانا نے چومے بھائی کے ہونٹ اور مرا گلا
تم اماں جان منہ کو تو سونگھو مرے ذرا ۔۔۔ کچھ بوئے ناگوار ہے میرے دہن میں کیا؟
بھائی کے لب سے اپنے لبوں کو ملاتے ہیں ۔۔۔ اب ہم نہ جائیں گے ہمیں نانا رلاتے ہیں
اس لئے آج ہم رہ کر اپنی جان گنوائیں گے اور ۔۔۔ نہ پانی پئیں گے اور نہ کھانا ہی کھائیں گے

[1] مرثیہ انیس جلد اول مطبوعہ بدایون ۱۲

یہ سن کر حضرت زہراؑ بہت پریشان ہو جاتی ہیں اور آپ کو رسول خداؐ کے پاس لے آتی ہیں اور امام حسنؑ کا منہ اور امام حسینؑ کا گلا چومنے کا سبب دریافت فرماتی ہیں، آنحضرتؐ اُن کی زہر سے اور ان کی تلوار سے شہادت کا واقعہ بطور پیشین گوئی کے بیان کرتے ہیں چنانچہ اس وقت سے آپ سب میں زیادہ عزیز ہو گئے آپ بچپن سے نہایت با اخلاق اور دین دار واقع ہوئے تھے،[1] جب آپ مدینہ سے کربلا کے لئے نکلتے ہیں تو تمام باشندگان شہر افسردہ و مغموم ہو جاتے ہیں اور چلاتے ہیں کہ خلق کا مخدوم چلا جا رہا ہے رانڈیں پکارتی ہیں کہ شاہ کی سواری تو جا رہی ہے اب مصیبتوں میں ہماری خبر کون لے گا، یتیم رو رہے ہیں اپاہج مضطر ہیں، ضعفاء آہ و زاری کرتے ہیں فقیر کہتے ہیں کہ اب ہم کو غنی کون کرے گا اور محتاجوں کی فاقہ شکنی کون کرے گا، تمام شہر والے بہت دور تک چھوڑنے کے لئے آپ کے ساتھ آتے ہیں اس وقت گو حضرت امامؑ انجام کار سے واقف ہیں لیکن دعوت قبول نہ کرنا انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ کوفی بدمعاش ہیں بیوفا ہیں لیکن اس وقت ان کی صدائے احتجاج پر لبیک کہنا اپنا اسلامی فرض خیال کرتے ہیں عیش و آرام اور عافیت و اطمینان پر ٹھوکر مار کر ان کی مدد کے لئے اپنے پیارے وطن کو الوداع کہتے ہیں

جب آپ مکہ پہنچتے ہیں تو وہاں بھی آپ کی عزت اور احترام خاص طور پر کیا جاتا ہے وہاں حضرت علیؑ کے جتنے دوست تھے وہ سب کہتے ہیں کہ نبی کے نواسے میں سب باپ کی خو بو ہے کعبہ میں آپ ایک دن بھی آرام لینے نہیں پاتے کیونکہ کوفے سے دن رات خطوط چلے آتے ہیں چنانچہ آپ احرام باندھ کر کھول دیتے ہیں اور ۸ ذی الحجہ کو کعبہ سے کوفہ کا رُخ کرتے ہیں۔

ابھی[2] کوفہ پہنچنے نہیں پاتے ہیں کہ ایک شخص ناقہ پر آتا ہوا دکھائی دیتا ہے امام حسینؑ عباسؑ سے فرماتے ہیں کہ "بھائی جان تم جا کر اس عرب کو بلا لاؤ کہ حسین غریب کو اس سے کچھ پوچھنا ہے" چنانچہ حضرت عباسؑ اس مسافر کو لے آتے ہیں اور امام حسینؑ اس کو کنارے لے جا کر فرماتے ہیں ؎

آتا ہوا کدھر سے ارادہ کدھر کا ہے گر نیک ہو سفر تو وسیلہ ظفر کا ہے

[1] مرثیہ سوم جلد اول نظامی پریس ۱۲ [2] مرثیہ سوم جلد اول نظامی پریس ۱۲

اور جب اس نے عرض کیا کہ میں کوفہ کے شہر سوم سے ادھر آتا ہوں تو آپ مسلم کی خبر دریافت فرماتے ہیں یہ سنتے ہی وہ رونے لگتا ہے،

شہ بولے وجہ کیا جو ترا حال غیر ہے　　جلدی بتا کے میرے مسافر کی خیر ہے

آخر کار حضرت مسلم کی شہادت کی خبر اور کوفیوں کی بے وفائی کا حال بیان کر کے وہ عرب کہتا ہے

ہاتوں کو جوڑتا ہوں میں شاہا نہ جائیے　　بہر علیؑ و احمدؐ و زہراؑ نہ جائیے

اس جا دغا ہے سید والا نہ جائیے　　آقا نہ جائیے مرے مولا نہ جائیے

جب شاہ نے عرب سے سارا ماجرا سنا تو فرمایا کہ سے

جو مسلم غریب پہ ہونا تھا ہو چکا　　باقی ہے کچھ جو ظلم وہ اب ہم پہ ہوئیگا

بندوں کا اختیار ہے کیا؟ جو رضائے رب　　دونوں یتیم بھی نہ بچے اس کے ہے غضب!

اور جب وہ عرب آپ کو اس طرف جانے سے منع کرتا ہے تو گو آپ واپس ہو سکتے تھے لیکن آپ کی صداقت، اخوت اور حمیت ہرگز گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ آپ واپسی کا خیال تک کر سکتے ہیں چنانچہ فرماتے

منہ کو سنان و تیغ سے موڑا نہ جائے گا　　مجھ سے خدا کی راہ کو چھوڑا نہ جائے گا

غرض کربلا[1] کے میدان میں پہنچکر قیام فرماتے ہیں، جب اعدا دریا کے کنارے مقام کرنے سے روکتے ہیں اور حضرت عباسؑ غضب میں آکر فوج شام کی طرف بڑھتے ہیں تو حضرت امامؑ کو برا معلوم ہوتا ہے آپ آواز دیتے ہیں اور پھر کس خوبی سے نصیحت فرماتے ہیں:-

"بھیا! ہمارے سر کی قسم روک لو حسام یکساں ہے بر و بحر ہماری نگاہ میں، غیض و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں، ہر چند کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے اور یہ بے شعور تم سے ناحق فساد کرتے ہیں لیکن جانے دو جاہلوں سے تکرار کیا ضرور رادنی سے بحث ننگ ہے عالیمقام کا اس خامشی جواب ہے ان کے کلام کا، اگرچہ ان کے بے ادبی قابل سزا ہے لیکن تم رحیم کے پسر ہو خطا بخشدو

[1] مرثیہ سوم ۱۲

ہر جگہ خدا ہے خواہ جنگل ہو کہ ترائی مظلوم کو غریب کو غصہ سے کیا کام؟ کرتا ہے عاجزی وہی جو خوش نشاں ہیں
ہے، یہ نانا کہ امت ہے ان پر رحم لازم ہے، حضرت مصطفیٰ انھیں بیٹوں کی طرح پیار کرتے تھے ۵

کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے؟؟

اس آخری شعر کے ذریعہ انیس نے حضرت امامؑ کی عالیشان سیرت کی ایک خاص جھلک دکھائی ہے، حضرت امامؑ جب دیکھتے ہیں کہ شام کی فوج لڑنے کو تیار ہو رہی ہے تو پہلے ہر طریقے سے سمجھاتے ہیں مثلاً

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو
تیر جوڑے ہیں جو تم نے تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادے پہ غربت میں جفا کرتے ہو
دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم بُرا کرتے ہو

. . . .

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی ہے ساز
یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ گداز؟
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینہ جو ہے سرفراز
کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پہ ہوں سوار؟
کس کی یہ تیغ ہے یہ تیغ دو سر کس کا ہے؟
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کا ہے؟

اور پھر ڈراتے ہیں کہ:-

تنگ آئے گا تو رکنے کا نہیں پھر شبیر
ایک حملہ میں فنا ہوں گے یہ دو لاکھ شریر
چل سکیں گے نہ تبر مجھ پہ نہ تلوار نہ تیر
کاٹ جائے گی سپر سب کے یہ بُرّاں شمشیر
شیر ہوں لخت دل غالب ہر غالب ہوں
میں جگر بند علی ابن ابی طالب ہوں

آخر کار جب اعدا کسی طرح سے نہیں مانتے ہیں تو آپ مجبور ہو کر جنگ کا حکم فرماتے ہیں اور اپنے ساتھیوں سمیت راہ حق میں مردانہ وار سر دیدیتے ہیں۔

یہ تو حضرت امام حسین کی پوری زندگی اور کردار کا ایک بیرونی خاکہ ہے اس کے علاوہ انیس نے جگہ جگہ آپ کے کردار کی بعض خصوصیات پر جو روشنی ڈالی ہے وہ نہایت قابل تعریف ہے آپ کی محبت اپنے بھائی بہن اور بھتیجوں، بھانجوں کے ساتھ، آپ کا برتاؤ اپنے دوستوں اور معتقدوں کے ساتھ ہمدردی

مخالفین کی خیر خواہی اور انھیں راہ راست پر لانے کی کوشش، صبر و رضا اور ہمت و استقلال کا زبردست اظہار ان تمام پہلوؤں کو اپنے مرثیوں کے ذریعہ نمایاں کر کے انیسؔ نے دنیا والوں کے آگے ایک ایسا عالیشان اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے جس کا اثر آنے والی نسلوں پر قیامت تک پڑتا رہے گا۔

بھائی کی محبت اور ان کے ساتھ برتاؤ کی ایک معمولی مثال یہ ہے کہ جب حضرت عباسؑ آپ کے فرمانے پر فوج شام کے ساتھ جنگ و جدل سے باز آتے ہیں لیکن ابھی غصہ باقی ہے اور غصہ کے مارے کانپ رہے ہیں تو ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر سمجھاتے ہیں کہ بھائی یہ کیا کیا! غصہ سے کیوں کانپتے ہو؟ تم وہ شیر ہو کہ ساری خدائی میں تمہاری دھاک ہے اور پھر جب دونو ملکر اپنی بہن حضرت زینبؑ کے پاس آتے ہیں اور وہ چھوٹے بھائی کو دیکھتے ہی لپٹ کر رونے لگتی ہیں تو ؎

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شۂ زمن
صدقہ اُتارو کچھ مرے بھائی پہ اے بہن
تھے دس ہزار مستعد جنگ تیغ زن
جیتا میں، زخمی ہوتے جو عباسؑ صف شکن
آزردہ ہیں کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا
دیکھو ابھی تلک نہیں ابرو سے بل گیا

یہ تھی ایک بڑے بھائی کی ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ محبت اور پاس خاطر کی مثال۔

اس قسم کی ایک اور جھلک جو امام حسینؑ کے کردار کو زیادہ تفصیل سے پیش کرتی ہے ایک اور موقع پر ضمناً رونما ہو گئی ہے، اہل بیت نبی کربلا کے لق و دق میدان میں کئی روز سے مقیم ہیں، آج اس منزل کی آخری رات ہے کل آفتاب غروب ہونے سے پہلے پنجتن پاک کا خاتمہ ہو جائے گا، حضرت امام حسینؑ باہر نماز شب میں مشغول ہیں اور ان کے یار و انصار جنگ کی اجازت کے متمنی کہ حرم سے رونے کی آواز آتی ہے سبب معلوم کر کے حضرتؑ زنانہ میں پہنچتے ہیں اور بہن زینبؑ سے آہ و زاری کا سبب دریافت کرنے میں مشغول ہیں کہ سب سے چھوٹی صاحبزادی سکینہ پکارتی ہیں ؎

نیند آئی ہے بیٹی کو سُلا جائیے بابا
بس ہو چکیں باتیں اب ادھر آئیے بابا

اس ایک شعر میں بلاغت کے کئی نکتے پنہاں ہیں! اعلیٰ انشا پردازی کا دار و مدار انتخاب مواقع پر ہے اور جو ادیب کسی واقعہ کو تفصیل سے پیش کرنے کی بجائے اس کا ایک اور صرف ایک ہی ایسا پہلو پیش کر دیتا ہے جس کے دیکھتے ہی دماغی فضا اس مرقعہ سے متعلقہ جملہ کائنات سے معمور ہو جائے وہ ایک زبردست صناع ہے، میر انیس خود تو تفصیل سے نہیں بیان کرتے کہ صاجزادی سکینہ ہمیشہ امام حسین کے ساتھ سونے کی عادی تھیں اور بن باپ کے انھیں نیند آنا دشوار تھا بلکہ اپنے رجال داستان ہی کی زبانی اس واقعہ کو نہایت اختصار اور خوبی سے پیش کر دیتے ہیں اور صرف یہی نہیں!! اس کے ذریعہ امام حسین کی پدرانہ شفقت ان کی گذشتہ زندگی کی حالت اور مستقبل کے متعلق نصیحت سب کچھ دکھا دیتے ہیں چنانچہ

حضرت نے کہا میں تری آواز کے قربان — اللہ اتم اب تک نہیں سوئی ہو مری جان
غربت میں کہاں راحت و آرام کا سامان — بن باپ کے تم کو تو نہیں چین کسی آن
اچھی نہیں عادت یہ نہ رویا کرو بی بی — پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی
کیا ہوئے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں — مجبور ہوں ایسے کہ تمہیں چھوڑ کے جائیں
تم پاؤ نہ ہم کو نہ تمہیں ہم کہیں پائیں — بی بی کہو پھر چھاتی پہ کس طرح سلائیں
جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی — برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی
جب عمر تھی کم ہم بھی چھٹے تھے یوں ہی ماں سے — سوتے تھے لپٹ کر یوں ہی خاتون جناں سے
کوچ ان کا ہوا سامنے آنکھوں کے جہاں سے — نا تم سے ملیں وہ نہ بکا ہے نہ فغاں سے
یہ داغ یہ اندوہ و الم سب کے لئے ہیں — ماں باپ زمانہ میں صدا کس کے جئے ہیں

خصوصاً چھٹا شعر:۔

جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی — برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی

کے ذریعہ ایک کم فہم لڑکی کو سمجھانے کا جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے وہ نہایت قابل تعریف ہے!! اور سوائے ایک زبردست رموز دانِ فطرت کے کسی اور شاعر سے اس کا اظہار ناممکن ہے۔

یہ سیرت تو ایک ایسے شخص کی تھی جو خاندان کا سردار اور گھر کا بڑا ہو، اب ہم مثال کے طور پر ایک اور

سیرت پیش کرتے ہیں جو پہلی ہستی کی مددگار و معاون اور دل سے بہی خواہ ہے، حضرت عباسؑ کا کردار اس قدر سبق آموز اور خوبصورت دکھایا گیا ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا انیس نے ان کی ہستی کو اس رنگ سے ظاہر کیا ہے :۔

حضرت عباسؑ امام حسینؑ کے چھوٹے بھائی ہیں حضرت علیؑ سے بالکل مشابہ ہونے کے علاوہ اُن کی دلاوری بھی خاص طور پر آپ کو ورثہ میں ملی ہے، بیت نبی کا سارا انتظام آپ ہی کے تفویض ہے جب امام حسینؑ مدینہ سے نکلتے ہیں تو سفر کی تیاریوں کا سارا اہتمام حضرت عباسؑ ہی کے ذمہ رہتا ہے۔

بہادری اور جنگجوئی کے ساتھ آپ میں اخلاق اور کسر نفسی بھی نمایاں تھی جو ایک حقیقی بہادر کے لئے ضروری ہے شکسپیر نے بھی اپنے مشہور ڈرامہ "شاہ ہنری چہارم" میں ایک نہایت بہادر امیرزادے کا کردار پیش کیا ہے لیکن ہنری ہاٹس پر کی شخصیت میں دلیرانہ طبیعت اور اصلی جنگجوئی کا جامع نمونہ موجود نہیں تھا جب اس کا مقابلہ عباس علی کے ساتھ کیا جائے تو وہ نرا وحشی اور خونخوار رہ جاتا ہے، برخلاف اس کے حضرت عباسؑ مجسمہ بہادری ہیں جب آپ کسی سے دوچار ہوتے ہیں تو سلام میں سبقت کرتے ہیں بڑے بھائی کی عزت و احترام کا آپ کو خاص طور پر خیال رہتا ہے، خود کو امام حسینؑ کا ایک معمولی غلام اور فرمانبردار کہتے ہیں، جب آپکے بہنوئی حضرت مسلمؑ کی شہادت کی خبر پہنچتی ہے آپ کی بہن اور بھانجیاں رونے لگتی ہیں اس وقت آپ بہن کو سمجھاتے ہیں کہ خدا پر نظر کرو ۵

سمجھیں گے اُن سے قاتل مسلم نظر میں ہیں
پیٹو نہ سر کو سید والا سفر میں ہیں
وابستہ جس کے دم سے ہو اس کا ہے خیال
لازم نہیں تمہیں کہ بھرے گھر میں کھولو بال
ہم سب غلام جن کے ہیں دیکھو تو ان کا حال
مانگو دعا جہاں میں رہے فاطمہ کا لال
لازم ہے تم کو صبر کہ دنیا میں نام ہو
اس کا زہے شرف کہ نثار امام ہو!!

جب امام حسینؑ کا قافلہ کربلا پہنچتا ہے حضرت عباسؑ بڑے بھائی سے ہاتھ جوڑ کر دریافت کرتے ہیں کہ خیمہ کہاں بپا کیا جائے؟ امام حسینؑ فرماتے ہیں ع زینبؑ جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا۔

حضرت عباسؑ یہ سنتے ہی پیچھے ہٹتے ہیں اور بڑی بہن زینبؑ کے پاس جا کر درخواست کرتے ہیں کہ

حاضر ہے جاں نثار امام غیور کا — برپا کہاں ہو خیمہ اقدس حضور کا

اور جب حضرت زینبؑ فرماتی ہیں کہ تم جہاں مناسب سمجھو وہیں اُتارو لیکن اتنا خیال رہے کہ ؎

دشمن بہت ہیں بادشہ خوش خصال کے — بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو — بھیا مجھے یہ ڈر ہے کہ ردّ و بدل نہ ہو

اس پر حضرت عباسؑ پہلے تو اپنی مصلحت اور خاکساری کے متعلق کچھ کہتے ہیں اور پھر اپنی فطری بہادری کے اقتضا سے کہہ اٹھتے ہیں کہ ؎

جس سرزمیں پہ دلبر زہرا عمل کرے — زہرا کسی کا کیا ہے کہ ردّ و بدل کرے

مانع وہ ہو جو دین نبی میں خلل کرے — کافر ہے جو حسینؑ سے جنگ و جدل کرے

غرض لڑائی کا مقام پسند کر کے ابھی خیموں کو کھلا ہی رہے ہیں کہ ہمراہیان امام حسینؑ شام کی فوج کی آمد آمد سے تشویش میں پڑ جاتے ہیں اس وقت ؎

کہنے لگے پکار کے عباسؑ حق شناس — ہاں ناصران قبلۂ کونین با حواس

دل میں نہ خوف ہو نہ زباں پر کلام یاس — جیتے ہو تو حسینؑ سے ہو قدر دان کے پاس

گر مر گئے تو روضۂ رضواں کی سیر ہے — دونو طرف مآل تمہارا بخیر ہے

کیا ڈر فشوں روم ہے یہ یا جنود شام — ہم اپنے کام میں ہیں ہمیں کیا کسی سے کام

جو مرد ہیں ہراس کے کرتے نہیں کلام — ہونے دو گر ہیں سرخ علم یا سیاہ فام

سرسبز ہیں وہی جو علیؑ کے نشان ہیں — خود جھک کے وہ ملیں گے کہ ہم میہماں ہیں

حضرت عباسؑ یہ فرما رہے ہیں کہ شام کی فوج کا سپہ سالار آگے بڑھ کر کہتا ہے:۔

"ہمارے امیر کا حکم ہے کہ آپ کو دریا کے قریب مقام نہ کرنے دیں، دس ہزار کوفی اس وقت ہمارے ساتھ ہیں اور ابھی لاکھوں ہیں جن میں کوئی قبل اور کوئی بعد آئے گا۔"

اس قدر سننے کے بعد حضرت عباسؑ جیسے دلاور کا جوش میں نہ آنا ممکن نہ تھا چنانچہ

عصہ میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق دم
نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے ہٹیں گے ہم؟
گر فوج قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم؟
گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم
بپھریں، جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی
تم کون ہو حسینؑ ہے مختار خشک و تر
ان کے سوا ہے کون شہنشاہ بحر و بر
دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر
شیروں کا یاں عمل ہے تمہیں کیا نہیں خبر؟
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

اس کے بعد آپ نہایت نرمی سے سمجھاتے ہیں کہ نبیؐ کے نواسے سے لڑنا گناہ ہے ہم تو تمہیں سیدوں کا خیر خواہ سمجھتے تھے! مہمانوں کی کیا خوب دعوت ہے واہ وا!! اگرچہ ہم لوگ خاکسار ہیں لیکن اگر کوئی سرکشی کرے تو اس کی تاب نہیں، ہم اسے فوراً پسپا کر دیں گے۔

حضرت عباسؑ ابھی سمجھا ہی رہے تھے کہ شامیوں نے حملہ کر دیا، ہمراہیان امام حسینؑ بھی جنگ کے لئے تیار ہو گئے، حضرت عباسؑ کا حملہ کے لئے بڑھنا تھا کہ سارے لشکر میں غل پڑ گیا، اہل بیت نبیؐ پریشان ہو گئے امام حسینؑ نے آواز دی کہ بھائی جان واپس آ جاؤ، یہ نہر کیا ہے جس کے لئے جنگ و جدل کی ضرورت ہے؟ یہ سنتے ہی اطاعت گزار بھائی غصہ کو پی جاتا ہے اور سر جھکا کر واپس آتا ہے یہ ہے وہ فرمانبرداری اور اطاعت گزاری جس کا گہرا سبق صرف انیس کے مرثیہ سے حاصل ہو سکتا ہے؟

غصہ میں انسان کو برے بھلے کی تمیز باقی نہیں رہتی اور پھر ایک جنگجو کا غصہ! ہاٹس پر اگرچہ جوش میں نہیں تھا لیکن وہ اپنے چچا کی منت سماجت کو ٹھکرا کر فوراً لڑائی شروع کر دیتا ہے صرف یہی نہیں وہ اکثر دفعہ اپنی ضد کے مقابلہ میں اپنے باپ کی تقریر کی بھی کوئی پروا نہیں کرتا اس کے برخلاف حضرت عباسؑ میں کہ سخت جوش کی حالت میں بھی بھائی کی بات پر سر جھکا دیتے ہیں اور جب وہ آپ کو سمجھاتے ہوئے خیمے میں لیجاتے ہیں تو آپ کی بیوی آپ کے کردار کو کس قدر عمدگی سے بیان کرتی ہیں ؎

کہنے لگی یہ زوجۂ عباسؑ خوش بیان　　غصہ میں ان کو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان
ہر بات میں ہے شیر الٰہی کی آن بان　　یہ جان کو بھلا کبھی سمجھے ہیں اپنی جان
آتا ہے غیظ جب، تو نہ کھاتے نہ پیتے ہیں　　یہ تو فقط حسینؑ کے صدقے میں جیتے ہیں

تمام ہمراہیان امامؑ شہید ہو چکے ہیں اور صرف حضرت عباسؑ اور صاحبزادگان اہل بیتؑ باقی ہیں۔ اس اثنا میں حضرت عباسؑ کو جنگ سے روکنے والا صرف بڑے بھائی کا حکم تھا جس کے لئے بار بار درخواست کی گئی تھی لیکن ہر دفعہ ناکامی کا سامنا ہوا، حضرت علی اکبر دم بدم چچا سے کہتے ہیں کہ اب ہم شہ دیں سے رخصت کو عرض کرتے ہیں تو ؎

فرماتے تھے اشارے سے عباسؑ ذی حشم　　کھیو نہ کچھ تمہیں سر شبیر کی قسم
پہلے فدا وہ ہوگا جو خدمت گزار ہے　　مر لے یہ جاں نثار تو پھر اختیار ہے

یہ کہہ کر امام حسینؑ کے قدموں پر سر رکھ دیتے ہیں، جب وہ سبب دریافت فرماتے ہیں تو عرض کرتے ہیں کہ صاحبزادی سکینہؑ پیاس سے سخت بے چین ہے اگر اجازت ہو تو ان کے لئے نہر سے پانی لاؤں حضرت عباسؑ کو یقین تھا کہ مہربان اور شفیق بھائی یوں تو جنگ کی اجازت دیتے نظر نہیں آتے اس حیلہ سے تو بھی کامیابی حاصل ہو گی غرض آپ جنگ کے لئے نکلتے ہیں اور ایک عظیم الشان شہادت حاصل کرتے ہیں۔

انیس نے جہاں جہاں حضرت عباسؑ کی معرکہ آرائیاں دکھلائی ہیں رزمیہ نگاری کو معراج کمال تک پہنچا دیا ہے، آپ کی لڑائی کا مفصل ذکر "انیس کی رزم نگاری" کے موضوع سے متعلق ہے یہاں ہمیں صرف آپ کی سیرت پیش کرنا مقصود تھا جس کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح ایک بہادر اور وفادار نوجوان اپنی شخصیت کو اپنے بھائی کی عظمت آب ہستی میں محو کر دیتا ہے اور دنیا والوں کے لئے ایک زندہ جاوید نمونہ بن جاتا ہے۔

(۴)

میر انیس کے کلام میں عورتوں کی نفسیات کے جو مرقعے پیش کئے گئے ہیں اور اُن کے جذبات و خیالات کو جس زبان و اسلوب بیان کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے وہی ان کے کلام کا زیادہ قابل عظمت اور زیادہ بحث طلب عنصر ہے، موخر الذکر یعنے عورتوں کی گفتگو اور محاورات سے دیگر مرثیہ گو شعرا نے بھی بینوں میں خاطر خواہ کام لیا ہے لیکن میر انیس کے یہاں اس کو جو وقعت حاصل ہے کسی اور کے کلام میں نہیں، پہلے تو ان کے گھرانے کی زبان ہی ایسی تھی کہ اگر وہ اپنی تمام زندگی میں اس پر ہر وقت فخر کیا کرتے تھے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، اور پھر اُن کا ذاتی شوق اور کوشش! جس کی بنا پر اُن کے ہر مرثیہ میں فصیح سے فصیح زبان اور لطیف سے لطیف محاورہ کا التزام رہتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان ہی میں فطرت کی جانب سے عورتوں کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کرنے کے لئے ایک خاص قدرت ودیعت کر دی گئی تھی، ان کے دادا میر حسن نے اپنی مثنوی میں بدر منیر کی جو حالت پیش کی ہے وہ بھی حد درجہ پاکیزہ ہے، برخلاف اس کے دیگر شعرا کی مثنویوں میں جہاں کہیں عورت کا مرقعہ پیش کیا گیا ہے اصلیت اور پاکیزگی کا بہت کم خیال رکھا گیا ہے۔

عورت کی نفسیات مرد کی نفسی کیفیات سے متغائر ہوتی ہے، وہ اگرچہ انتہا درجہ کی حساس ہوتی ہے، لیکن ہر وقت صبر و استقلال سے کام لیتی ہے، بعض نزاکتوں کی طرف اس کی فطرت اس قدر عجلت کے ساتھ منتقل ہو جاتی اور اُن سے تکیف ہونے لگتی ہے کہ مرد انھیں بدقت تمام معلوم کر کے ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، اور جن باتوں کو وہ آسانی سے نہیں سمجھتی انھیں سمجھ جانے کے بعد ان پر ایسی راسخ العمل ہو جاتی ہے کہ پھر جان دیدینا گوارا کرے گی مگر اپنا خیال پلٹنا اس کے لئے ناممکن ہوگا۔

یہ باتیں ایسی ہیں جو ہر ملک اور ہر قوم کی عورت کو اپنی ماں کے ورثہ میں ہاتھ آتی ہیں لیکن بعض خصوصیات ایسی بھی ہیں جو ہر جگہ کی عورت میں مشترک نہیں ہوتیں، اس بارے میں سب سے زیادہ اثر ان کا ماحول

ہوتا ہے، امریکہ، عربستان، ہند اور جاپان کی عورتوں کی فطرتوں میں (متذکرہ بالا صفات کو چھوڑ کر) بے حد اختلاف ہوگا، عورتیں تو خیر ایک محدود فضا میں مقید رہتی ہیں ان ممالک کے مرد بھی نفسیات کے لحاظ سے آپس میں بیحد مختلف ہیں۔

اس روشن زمانہ میں جب کہ تمام دنیا مختلف النوع ذرائع آمد و رفت کی آسانی کے باعث قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے دور دور کے ممالک ایک ہی شہر کے متفرق محلوں کی شکل میں منتقل ہوتے جا رہے ہیں اس بات کی ان تھک کوشش ہو رہی ہیں کہ تمام دنیا کے مختلف میلانات کو ایک اور صرف ایک ہی نقطہ پر لا کر ٹھہرا لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مقصد کے حصول کے لئے جو ذریعے اختیار کئے جا رہے ہیں وہ ایک حد تک مفید ضرور ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ جب تک کسی نہ کسی طریقہ سے تمام دنیا کی عورتوں کی فطرت کو ایک نہ کر لیا جائے گا اس مقصد میں ہرگز کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

عربستان کی عورت ہندوستان کی عورت سے بالکل جدا ہوتی ہے اگر ہندوستانی مرد کے سامنے ایک چینی عورت کی نفسیات پیش کی جائے اور نہ بتایا جائے کہ یہ ایک عورت ہے تو وہ اس قسم کی فطرت والی ہستی کو ہرگز عورت نہ سمجھیگا، اسی طرح فرانس یا امریکہ والوں کے آگے ہندوستان کی پردہ نشینوں کی فطرت کا مرقع بغیر "ہندوستانی عورت" لکھے پیش ہو تو وہ اس کو ایک عجیب اور نئی قسم کی مخلوق خیال کریں گے مگر عورت خواہ کہیں کی ہو جب مرد کے سامنے آجاتی ہے اس کے "دائرہ پرستش" کا ایک مستقل مرکز اور تخیلات و جذبات کا ایک یقینی جولانگاہ بن جاتی ہے وہ اپنے جنس مقابل کے لئے (اگرچہ اس کا ہم رنگ و ہم مزاج نہ سہی) ایک ایسا نغمۂ سرمدی چھوڑ جاتی ہے جس سے متاثر ہوئے بغیر دنیا کا کوئی مرد نہیں رہ سکتا اس کی مضطرب ہستی مرد کے ساز فطرت کے ہر تار کو چھیڑ جاتی ہے وہ اس کی عقلی، اخلاقی اور روحانی غرض ہر قسم کی قوتوں میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔

میر انیس اگر ہندوستان کی نظروں کے آگے ایک عرب عورت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتے تو ان کے کلام کو

اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہوتی، کیونکہ ہندوستانی ان کی پیش کردہ ہستیوں کو اپنی چیز نہ سمجھ کر اُن سے غیریت برتتے، اور یہ مغائرت انھیں ان ہمدردیوں اور اس پرخلوص محبت سے روکے رکھتی جو آج میر انیس کے پڑھنے کے بعد حضرت زہراؑ، حضرت زینبؑ، حضرت بانو، حضرت صغریٰؑ، یا حضرت کلثومؑ وغیرہ کے متعلق دلوں میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، ایک زبردست صناع کے لئے اس راز سے واقف ہو جانا ضروری تھا، اسی لئے میر انیس نے جن نسائی سیرتوں کو پیش کیا ہے ان میں ایک حد معینہ تک ہندستانی فطرت کو بھی شامل کیا ہے۔

جہاں تک بین کا تعلق ہے ان کے مرثیوں کی جملہ عورتیں ہندی ہیں، رسم و رواج کے لحاظ سے یہ سب نصف ہندی ہیں اور نصف عرب اور ان کے قطع نظر کرنے کے بعد جب حضرت زہراؑ، حضرت زینبؑ وغیرہ کے کردار پر نظر ڈالی جاتی ہے، تو وہ بالکل عرب عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔

مثلاً سب سے پہلے مرثیہ میں حضرت فاطمہؑ کا کردار پیش کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ جب کہ دونوں بچے تھے آنحضرتؐ رسول خدا کے پاس کھیلتے کھیلتے پہنچ جاتے ہیں امام حسینؑ نانا کو اپنے بھائی کا منہ اور اپنا گلا چومتے ہوئے دیکھ کر غصہ میں آجاتے ہیں کہ نانا نے ہمارا منہ بھی کیوں نہ چوما اور روتے ہوئے گھر واپس آتے ہیں، حضرت زہراؑ جب اپنے چھوٹے لڑکے کو روتا ہوا دیکھتی ہیں تو اس وقت ان کی جو کیفیت اور ان کی زبان سے جو گفتگو ظاہر کی ہے وہ ایک حد تک ہندوستانی عورت کی فطرت اور نفسیات سے متعلق ہے، چنانچہ ماں اپنے بچے سے کہتی ہیں ؎

ہے ہے حسینؑ کیا ہوا تو کیوں ہے اشکبار
تجھ کو رُلا کے غم میں مجھے مبتلا کیا ۔۔۔ قربان ہو گئی تجھے کس نے خفا کیا؟
میرا کلیجہ پھٹتا ہے اے دلربا نہ رُو ۔۔۔ زہراؑ ہزار جان سے تجھ پر فدا نہ رُو
سر میں نہ درد ہو کہیں اے مہ لقا نہ رُو ۔۔۔ بس بس نہ رو حسینؑ برائے خدا نہ رُو

کہتے کہتے آخر کار چادر سے منہ ڈھانپ کر خود بھی رونے لگتی ہیں اور کہتی ہیں۔

گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو　　سمجھی میں کچھ حسنؑ سے خفا ہو کے آئے ہو
تم چپ رہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھر کے آئیں　　گزری میں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رلائیں
اُن سے نہ بولیو وہ تمہیں لاکھ گر منائیں　　لو آوجانے دو تمہیں چھاتی سے ہم لگائیں
واری اگر حسنؑ نے رلایا بُرا کیا　　پوچھوں گی کیا نہ میں مرے بچے نے کیا کیا؟

اور لڑکا جب اپنی ماں سے کہتا ہے کہ نانا نے آج بھائی کا منہ چوما ہمارا نہیں اس لئے ہم رو رو کے اپنی جان گنوائیں گے نہ پانی پئیں گے اور نہ کھانا کھائیں گے اس پر ماں کی زبان سے حسب ذیل محبت بھرے جملے نکلتے ہیں۔

صدقے گئی کرو نہ کلیجہ کو میرے شق　　ہے ہے یہ کیا کیا مجھے ہوتا ہے اب قلق
بیرا لہو بہے گا جو آنسو بہاؤ گے　　کاہے کو ماں جئے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

اس کے بعد لڑکے کو نانا کے پاس لیجانے اور وہاں کی گفتگو کا جو مرقعہ پیش کیا ہے اس میں عربی کردار جھلک جاتا ہے چنانچہ منہ کے نہ چومنے کے متعلق کسی قسم کا شکوہ شکایت کرنے کی بجائے کہتی ہیں

روٹھے تھے یہ سو قدموں پہ سر دھرنے آئے ہیں　　منہ کے نہ چومنے کا گلا کرنے آئے ہیں

اور جب رسول خدا رونے لگتے ہیں تو یہ تاڑ جاتی ہیں اور کہتی ہیں۔

کیوں بابا جان خیر تو ہے اس کی جان کی　　فاقہ میں کاٹتی ہوں مصیبت جہان کی

اور جب وہ حقیقت حال سے آگاہ فرماتے ہیں تو اپنے باپ کے بدلے پر کہتی ہیں۔

قدرت ہے سب طرح کی شہ مشرقین کو　　حضرت سے لوں گی اپنے حسنؑ اور حسینؑ کو

پھر غصہ میں آجاتی ہیں کہ "کیا ان کو قتل کرنا آسان ہے؟ کیا اس دن شیر حق کمر سے ذوالفقار نہیں کھولیں گے؟ کیا میں بال کھولے ہوئے باہر نہ نکلجاؤں گی اور عرش عظیم کا پایہ نہ ہلاؤں گی تو حضرتؐ فرماتے ہیں کہ اس وقت نہ میں ہوں گا نہ علیؑ، نہ فاطمہؑ اور نہ حسنؑ تو زہراؑ کہتی ہیں کہ

ہم میں سے ایسے وقت جو کوئی نہ ہوئے گا　　ہے ہے مرے حسینؑ کو پھر کون روئے گا

آخر کار مذہب اور باباجان کی خاطر سینہ پر پتھر رکھنا گوارا کرلیتی ہیں اور پھر محبت سے مجبور ہو کر باباجان سے کہتی ہیں۔

کیجے دُعا کہ خالق اکبر مدد کرے   اللہ یہ بامرے بچّے کی رد کرے

حضرت زہرا کا تو ایک ضمنی ذکر تھا لیکن میر انیس نے حضرت زینب اور حضرت صغریٰ کا نسائی کردار نہایت مکمل حالت میں پیش کیا ہے انھی دونوں کے بیانات میں انھوں نے عورتوں کی فطرت سے واقفیت کی پوری قدرت دکھا دی ہے حضرت صغریٰ کے کردار پر اب تک متعدد طریقوں سے روشنی ڈالی جا چکی ہے اس لیے ہم اپنے اس مضمون میں اس سے قطع نظر کر کے صرف حضرت زینبؑ کی سیرۃ پر ایک نظر ڈالتے ہیں انیس نے کئی مرثیوں اور بالخصوص مرثیہ نمبر ۶۔ ۷۔ ۸ اور ۹ میں ان کے کردار کو خاص طور پر ظاہر کیا ہے ہم ذیل میں ان تمام مرثیوں کے متفرق حالات کو ایک منضبط شکل میں پیش کرتے ہوئے انیس کی اس قسم کی صناعی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حضرت زینبؑ امام حسینؑ کی چاہیتی بہن ہیں ان کو اپنے بھائی کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز عزیز نہیں، مدینہ سے نکلتے وقت جب محلہ کی عورتیں آکر سمجھاتی ہیں کہ ع گھر فاطمہ زہراؑ کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں اور رنج والم کا اظہار کرتی ہیں تو آپ فرماتی ہیں کہ صرف آپ لوگوں ہی کو اس کا رنج نہیں ہے بلکہ ؎

مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی   بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

میں فاقہ کر کے بھی اماں کی لحد سے نہ جاتی لیکن کیا کروں بھائی کی طرف دیکھ کر میری چھاتی بھر آتی ہے اور بے جائے کوئی بات بن نہیں آتی، کیونکہ ظاہر میں تو اماں قبر میں سوتی نظر آتی ہیں لیکن جب کبھی میں خواب دیکھتی ہوں تو انھیں روتے ہوئے دیکھتی ہوں انھوں نے مجھے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ حسینؑ کا نہ باپ ہے نہ ماں ہے اس لیے اس کے غم میں تو رفاقت کرنا مجھے ان کی وصیت رہ رہ کر یاد آتی ہے کہ ؎

اُس دن مری تربت سے بھی منہ موڑیو زینبؑ   اس بھائی کو تنہا نہ کہیں چھوڑیو زینبؑ

گھر بھائی سے تھا جب بھائی نہیں تو گھر بھی نہیں، اب خواہ اسی سے ہاتھ بند ہیں یا لوسے میں سر کھلے کچھ ہی کیوں نہ ہو، زینب بھائی کے ہمراہ ہے اور اس کوچ کے انجام سے بھی آگاہ ہے۔

غرض ایک محبت والی اور وفادار بہن اپنے بیمار و ناتوان شوہر کو مدینہ میں چھوڑ کر بھائی کی رفاقت کے لئے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اپنے گھر سے نکلتی ہے۔

کربلا پہنچنے کے بعد انتخاب قیام گاہ کے وقت حضرت زینبؑ اور حضرت عباسؑ میں جو دردآمیز گفتگو ہوتی ہے وہ حضرت عباسؑ ہی کے بیان میں پیش کر دی گئی، اس کے بعد یہاں اس فیاض عورت کے ایک ایثار کا موقع آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کربلا میں حضرت امام حسینؑ اپنی فوج کی تنظیم کرنے لگتے ہیں تو حضرت زینبؑ کے صاحبزادوں کو خیال ہوتا ہے کہ فوج کی علمبرداری ہمارا موروثی حق ہے اس لئے دونوں آپس میں مشورہ کرتے ہیں کہ کیوں بھائی! علم لینے کے لئے ہم ماموں سے کہیں؟ اس لئے کہ ہم دونو طرف سے حقدار ہیں ہمارے دادا اور نانا دونو علمدار رتھے، بڑا کھٹکا ہے کہ ہمارا یہ عرض کرنے کا موقع نہیں، ماموں مالک و مختار ہیں، وہ جس کو چاہیں دیں، ہمارا بڑا عہدہ تو یہی ہے کہ ماموں پر فدا ہو جائیں، چپکے رہو اماں سنکر کہیں خفا نہ ہو جائیں۔

حضرت زینبؑ پردے کے پیچھے سے یہ گفتگو سن لیتی ہیں اور فضہ کے ذریعہ انہیں بلا کر جھڑکتی ہوئی کہتی ہیں کہ تم ابھی کیا باتیں کر رہے تھے ؎

سمجھے نہ کہ مادر عقب پردہ کھڑی ہے گھر لٹتا ہے میرا تمھیں منصب کی پڑی ہے

میں دیکھ رہی ہوں کہ جب سے علم نکلا ہے تمہارے تیور اور ہی ہو گئے ہیں، تمہارا سن ابھی کم ہے تمہارے قد ابھی چھوٹے سے ہیں، یہ کھیل نہیں محمدؐ کا علم ہے! مانا یہ تمہارا حق ہے لیکن میں اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتی ہوں یہ علم اسی کو ملے گا ؎

بگڑوں گی گلہ گر کسی اسلوب کرو گے عباسؑ سے کیا تم مجھے محجوب کرو گے؟

دیکھو عباسؑ کو علم ملتے ہی تم انھیں جا کر تہنیت علم دو ؂

کنبہ میں ایک نے بھی اگر سن لیا یہ حال کہتی ہوں صاف میں مجھے ہوگا بہت ملال
صدقے گئی خلاف ادب کچھ سخن نہ ہو میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

اور تم اپنے ماموں کے قدم پر اپنے سر کو فدا کر دو دیکھو اگر قاسمؑ و اکبرؑ تم سے پہلے میدان میں زخمی ہوئے تو پھر تم میرے فرزند نہیں تم دونو کی ماں۔

یہ ہے ایک عرب عورت کی فیاضی کہ اپنے بیٹوں کے مقابلہ میں بھائی کو ترجیح دیتی ہے اور یہ ہے ایک بہادر عورت کا ایثار کہ اپنے موروثی حق سے اپنے چھوٹے بھائی کو سرفراز کرتی ہے!!

حضرت زینبؑ کا کردار بالکل عربی ہے، انیسؔ نے صرف ایک معینہ حد تک انھیں ہندی نفسیات سے متعلق کیا ہے اور وہ بھی صرف بینوں میں، جہاں مجبوری تھی، کیونکہ بغیر اس عنصر کے مرثیہ گوئی کا مقصد (یعنی رونا اور رُلانا) فوت ہو جاتا تھا۔ حضرت زینبؑ کی عرب نفسیات اس وقت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے، جب کربلا کے میدان میں تمام رفقاء شہادت سے سرفراز ہو گئے ہیں اور صرف گھر والے باقی رہ جاتے ہیں، حضرت زینبؑ کو بُرا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ان کے بچوں کی لاشیں کیوں نہ آئیں؟ چنانچہ اپنے لڑکوں کے متعلق کہتی ہیں ؂

آتا ہے دم صبح سے یاں لاشہ پہ لاشہ ان کے لئے اوروں کی لڑائی ہی تماشہ
پائی نہ اجازت یہ سخن خوب تراشا باتیں ہیں یہ ساری مجھے باور نہیں آتا
رکتے ہیں دلاور کہیں روکے سے کسی کے وہ سب بھی تو پیارے تھے حسینؑ ابن علیؑ کے
میں جانتی تھی پہلے اجازت وہی لیں گے اس کی نہ خبر تھی کہ دغا وقت پہ دیں گے

جب صاحبزادے ماموں سے بدقت تمام جنگ کی اجازت لے کر ماں سے رخصت ہوتے آتے ہیں تو یہ خفا ہو جاتی ہیں کہ یہ دونو اب تک کیوں نہ جنگ پر روانہ ہوئے اور ماموں کے لئے

جانیں کیوں نہ دیدیں، چنانچہ انھیں ڈرپوک اور بے وفا سمجھ کر ان کی طرف دیکھنا نہیں چاہتی بلکہ

منہ پھیر کے کہنے لگیں یہ شاہ کی ہمشیر / غیرت کی ہے جا غیر تو ہوں فدیۂ شبیر
شکوہ ہے مقدر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر / منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحب شمشیر
انصاف تو کیجے مجھے کیونکر نہ گلا ہو / وہ پہلے نہ بیدم ہو لہو جن میں ملا ہو
آفت ہے یگانے ہی جو ہمت نہ کریں گے / یہ کس نے کہا تھا کہ ہمیں پہلے مریں گے

فرزند حسن مرنے کو چالیں تو یہ جائیں / عباسؑ علی خون میں نہالیں تو یہ جائیں
ہم شکل علیؑ برچھیاں کھالیں تو یہ جائیں / لاشے ابھی شہزادوں کی آلیں تو یہ جائیں
کھلتا نہیں کچھ زور شجاعت انھیں کیوں ہے / حضرتؑ تو سلامت ہیں یہ عجلت انھیں کیوں ہے

کیوں روتے ہیں کیا چھن گئی سر سے مرے چادر / خالی ابھی ہو لے دیں محمدؐ کا بھرا گھر
وقت آئے تو دکھلائیں گے تلواروں کے جوہر / جرأت میں وہ جعفر ہیں شجاعت میں یہ حیدر
جب کوئی نہ ہوئے گا تو یہ جنگ کریں گے / کیا عیب ہے پہلے نہ مرے بعد مریں گے

میں سمجھی تھی پہلے ہی یہ ڈھونڈیں گے بہانا / کچھ منہ کا نوالہ نہیں تلواروں کا کھانا
لازم تھا اسی وقت انھیں خیمہ میں آنا / سچ ہے کہ وفاداروں سے خالی ہے زمانا

ماں کو تو تنک کر چکے کنبہ کی نظر میں / میں لٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں
پوچھے کوئی ان سے کہ یہ کیوں آئے ہیں گھر میں / کھولیں اسے باندھیں ہیں جو ہتیار کمر میں
فوجوں میں یہی طور تھے خالق کے ولی کے؟ / لو ناز ہے اس پر کہ نواسے ہیں علیؑ کے

توڑ آئے ہوں خیبر سے کسی در کو تو کہہ دیں / مارا ہو جو مرحب سے دلاور کو تو کہہ دیں
تا کوفہ بھگا آئے ہوں لشکر کو تو کہدیں / خوشنود کیا ہو جو برادر کو تو کہدیں
چپ کیوں ہیں جو نصرت کی خبر لیکے پھرے ہیں / کیا شام کے سردار کا سر لے کے پھرے ہیں؟

عورت اکثر کسی بات کو صاف سیدھے طور پر نہیں بیان کرتی، خصوصاً جب وہ غصہ میں ہوتی ہے، تو اپنے ہر مطلب کو طعن و تشنیع کے ذریعہ ادا کرنا چاہتی ہے اور صرف اسی ایک بات کو پیش نہیں کرتی، جس سے وہ متاثر ہوئی ہے بلکہ اس سے متعلقہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے سناتی جاتی ہے، جب اس کے دل پر کوئی ٹھیس لگتی ہے تو پہلے زبان سے ظاہر کرنا تو کجا وہ حتی الامکان اس امر کی کوشش کرتی ہے کہ اپنی قلبی واردات اور ذہنی کیفیات اپنے بشرہ سے بھی ظاہر نہ ہونے پائیں، لیکن جب کسی وجہ سے وہ پھوٹ پڑتی ہے تو اس کے محیط جذبات میں ایک ایسا تلاطم انگیز ہیجان پیدا ہوتا ہے کہ غم و غصہ کے تیز و تند سیلاب اس کی آنکھوں اور زبان سے نکلے بغیر نہیں رہ سکتے اور نہ دنیا کی کوئی طاقت انھیں بہنے سے روک سکتی ہے۔

حضرت زینبؑ ایک عورت ہیں اور خاص کر عرب کی عورت، ان کا جوش جس قدر بڑھا ہوا نظر آئے کم ہے اور اگر ان کی زبان سے مسلسل ہمت افزا طعن آمیز جملے نکلتے جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، تعجب تو اس وقت ہوتا جب کہ وہ ایسی نازک حالت میں بھی متاثر ہوئے بغیر رہتیں، بیگانوں کو شہادت کا مرتبہ حاصل کرتا ہوا دیکھ کر ان کی رگ حمیت جوش میں نہ آتی، اپنے بھائی عزیز تر بھائی کے برے وقت میں اپنے بچوں کو قربان کئے بغیر خاموش رہ جاتیں، یہ ایک عورت، عرب عورت اور بالخصوص خاندان رسالت مآب کی عورت، کے لئے ناممکن تھا! جس کی رگ رگ میں محبت و الفت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دئے گئے ہوں، جس کی بات بات میں صداقت اور حمیت کے پھول جھڑتے رہتے ہوں اور جس کے قدم قدم پر فیاضی اور ایثار کے نشان قائم ہوتے جاتے ہوں، ماں کا غصہ دیکھ کر لڑکے کانپ جاتے ہیں اور نہایت عاجزی سے عرض کرتے ہیں

آزردہ نہ ہوں آپ ہمیں تھا یہی وسواس — جب بڑھتے تھے ہم روکتے تھے حضرت عباسؑ
جوڑے ہیں کبھی ہاتھ کبھی گرد پھرے ہیں — راضی ہوئے، جب پاؤں پہ اس وقت گرے ہیں

ایک مرثیہ میں دکھایا گیا ہے کہ صاحبزادے خود آکر اپنی والدہ کو اجازت جنگ کی خوشخبری نہیں سناتے بلکہ فضہ معلوم کراتی ہے کہ عون و محمد اب جنگ کو جا رہے ہیں تو حضرت زینبؑ بجائے کسی قسم کی تشویش کے خدا کا شکر بجا لاتی ہیں کہ اب میرا مطلب بر آیا، وہ اس وقت یہ آرزو نہیں کرتیں کہ اپنے بچے جنگ سے زندہ بچ کر آئیں، بلکہ کہتی ہیں کہ میرے بچوں کی عزت یا رب تیرے ہاتھ ہے تو ان کی مدد کر، کیونکہ وہ علیؑ کے نواسے ہیں، اور اب یہ خوشخبری آئے کہ دونوں مارے گئے اور ولی ابن ولی کے فدیوں میں محسوب ہوئے۔

حضرت زینبؑ صرف اپنے بچوں کی قربانی پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ کہتی ہیں کہ اگر ان کا باپ (یعنی زینبؑ کا شوہر) ہوتا تو وہ بھی آپ (امام حسینؑ) کے لئے جان دیدیتا کیونکہ ہم سب پر آپ کا حق ہے اور جب ہمارا حق ان بچوں پر ہے تو پھر کیوں نہ وہ اس حق کو ادا کریں چنانچہ کس خلوص سے کہتی ہیں ؎

باپ ان کا آج ہوتا جو یا شاہ نامدار — کرتا قدم کو سر پہ تصدق بہ افتخار
ایک اُن کے بدلہ آپ کے قدموں پہ ہوں نثار — میرے عوض فدا کرے ایک اپنی جان زار
ان پہ ہمارا حق ہے تو ہم پر حق آپ کا — یہ بھی تو حق ادا کریں کچھ اپنے باپ کا

اس وقت حضرت امام حسینؑ اپنی بہن کو ہر طرح سے سمجھاتے ہیں کہ " میں عون و محمدؑ کو جنگ کی اجازت ضرور دیتا لیکن اول تو وہ کم سن ہیں اور دوم یہ کہ ان کے بعد جعفر طیارؑ کی نسل کا خاتمہ ہو جائے گا اس لئے مجبور ہوں " مگر حضرت زینبؑ اپنے بھائی کے مقابلہ میں ایک پوری نسل کے معدوم ہونے کو کچھ نہیں سمجھتیں، یہ عالیشان جذبہ ایثار عام عورتوں اور حضرت زینبؑ میں حد امتیاز قایم کرتا ہے، جب تک عورت ان بیاہی رہتی ہے اپنے بھائی بہنوں سے اسکو بے حد محبت رہتی ہے لیکن میکہ سے نکلنے اور اولاد ہو جانے کے بعد اس کو اپنی اولاد اور اپنے

خاوند سے جس قدر محبت ہو جاتی ہے اپنے بھائی بہن سے اتنی ہرگز باقی نہیں رہتی، اگر اس کے بھائی اور بچے دونوں ایک ہی چیز کے خواہشمند ہوں تو وہ اپنے بھائی پر اپنے بچوں کو ہر حال میں ترجیح دیگی، یہ دنیا کی تمام عورتوں کی سرشت میں داخل ہے لیکن بعض غیر معمولی مردوں کی طرح بعض عورتیں بھی ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جن کی فیاضی دنیا کی دیگر عورتوں کے لئے ایک عالیشان نمونہ بن جاتی ہے، جن کا ایثار اپنی قبیل کی اور مخلوق کے واسطے ایک خوشنما جادہ عمل پیدا کر دیتا ہے اور جن کی محبت سارے دنیا میں ایک زندہ جاوید نغمہ چھوڑ جاتی ہے چنانچہ حضرت زینبؑ امام حسینؑ کی چھاتی سے سر لگا کر نہایت عاجزی سے کہتی ہیں کہ یا امام ؎

شہ ان کے باب میں اب کد نہ کیجئے ہدیہ فقیر کا ہے اسے رد نہ کیجئے

ان بیانات کے بعد حضرت زینبؑ کے کردار کا ایک زبردست عنصر پیش نظر ہوتا ہے جو صرف ایک عرب عورت کے لئے مخصوص ہے، دنیا کی کوئی عورت جرأت اور دلیری کے ایسے اعلیٰ جذبات وتخیلات نہیں رکھتی جیسے کہ ایک عرب عورت کو عطا کئے جاتے ہیں، اس کا بچپن لڑکوں کے ساتھ ساتھ خونخوار معرکوں کے گہواروں میں گزرتا ہے، اس کی جوانی نوجوان مردوں کے مُردہ قلوب کو گرمانے، ان کی رگ حمیّت کو جوش میں لانے، اپنے گھر، اپنے قبیلہ، اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے جان دیدینے پر اکساتی ہے اور اُن کی کاہلی اور پژمردگی کو بجلی بن کر جلا دیتی ہے اور اس کا بڑھاپا عرصہ ہائے کارزار کے زخمی بچوں، بھائیوں کی نگہداشت، بھولے بھٹکے مسافروں کی امداد، اور غریبوں، لاوارثوں اور بےکسوں کی غمخواری میں گزر جاتا ہے، وہ ایک ہندوستانی عورت کی طرح کسی کو اپنے گھر، خاوند اور بچوں پر حملہ کرتے ہوئے دیکھ کر کسی تہ خانے کے گوشہ میں چھپنے، کسی باؤلی میں ڈوب مرنے، یا کسی آگ میں جل جانے کی کوشش نہیں کرتی، بلکہ ہمت اور عقلمندی کے ذریعہ ایسے طریقے اختیار کرتی ہے کہ حملہ آور کو منہ کی کھانی پڑے۔

حضرت زینبؑ کے صاحبزادے جب لڑائی کے لئے نکلتے ہیں تو وہ ایک ہندوستانی عورت کی طرح رونے رلانے کی بجائے ان کو جنگ کی ہمت دلاتی اور جوانمردوں کے ساتھ مرنے مارنے پر آمادہ کرتی ہیں ؎

ہاں چاہئے منہ نیزہ و خنجر سے نہ پھیرو
دو شیر ہو مل کر عمر و شمر کو گھیرو

توقیر تمہاری ہو مری ناموری ہو
سر دونوں کے لاؤ تو میں جانوں کہ جری ہو

یوں سب میں یہ سرتاج دلیروں کے تمہیں ہو
ماں صدقے گئی شیر تو شیروں کے تمہیں ہو

اس گھر کے بزرگوں کا چلن تیغ زنی ہے
جو فقر میں کرتا ہے سخاوت وہ غنی ہے

بودے کی کہاں آنکھ کہاں مرد کے تیور
چھپتے نہیں لاکھوں میں جوانمرد کے تیور

ہمراہ کوئی واں سے نہیں لاتا ہے رتبہ
جو نام پہ مرتا ہے وہی پاتا ہے رتبہ

سر بیچ کے ذی قدر کو ہاتھ آتا ہے رتبہ
ہٹتا ہے قدم بڑھ کے تو گھٹ جاتا ہے رتبہ

مرکر نہ ہٹے قابل احسنت وہی ہے
جو کھیت میں سرسبز ہو سا ونت وہی ہے

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی
گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی

تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی
بجلی بھی گرے گر تو جھجکتے نہیں غازی

دم ہونٹوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی
مرنے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی

ماں صدقے گئی گھاٹ پہ دریا کے نہ جانا
پانی کی طرف پیاس میں گھبرا کے نہ جانا

ساحل پہ کبھی سرد ہوا کھا کے نہ جانا
صابر ہو تو رہواروں کو گرما کے نہ جانا

ایسے تو نہیں جو مجھے محجوب کروگے
میں دودھ نہ بخشوں گی جو پیاسے نہ مروگے

بھائی کسی ہنگام میں بھائی کو نہ چھوڑے
دو نوں میں کوئی عقدہ کشائی کو نہ چھوڑے

اک بھائی لڑے بڑھ کے جو ہاتھ ایک کا تھک جائے
بلوا جو پھر اُس پر ہو تو یہ بھر کمک جائے

ہاتھوں میں صفائی ہو کہ بسمل بھی پھڑک جائے
گر صف ہو تو پسپا ہو پرا ہو تو سرک جائے

حملوں میں سب انداز ہوں خالق کے ولی کے
پہچان لیں وہ سب کہ نواسے ہیں علیؑ کے

اس جنگ کا چرچا مصر و شام رہیگا
دنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا

ایک اور مرثیہ میں اسی موقع پر حسب ذیل طریقہ پر اکساتی ہیں ؎

نوجوں کو مرے دودھ کی تاثیر دکھانا
دادا کی طرح جوہر شمشیر دکھانا

مظلومیت حضرت شبیرؑ دکھانا
تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھانا

تلوار اگر لاکھ چلیں سر نہ فرد ہو
جو سامنے آجائے وہ اک وار میں دو ہو

دم ہونٹوں پہ آجائے اگر پیاس کے مارے
غش کھا کے جو گر پو بھی تو دریا کے کنارے

پانی کو ترستے رفقا مر گئے سارے
یہ آب رواں بند ہے ماموں پہ تمہارے

تلواریں ہیں موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہے لہو کا اسے پانی نہ سمجھنا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست اور تجربہ کار سپہ سالار اپنے نوجوان سپاہیوں کو کسی عظیم الشان معرکہ جنگ کے لئے جوش دلا رہا ہے، وہ صرف خطرناک حملہ ہی کا حکم نہیں دیتا بلکہ اپنے کمزور مخاطبوں کو ان کے نامور اسلاف اور بہادر افراد کے کارنامے یاد دلا دلا کر ان کی ہمت بڑھاتا ہے اور ساتھ ہی ان کی ناتجربہ کاری کا بھی اسے علم ہے اس لئے وہ دوران تقریر میں نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ ان کو نصیحتیں بھی کرتا ہے تاکہ وہ اسرار فتحمندی سے واقف ہو جائیں۔ حضرت زینب اپنی قومی اور خاندانی روایتوں کے مطابق اپنے بچوں کو نام آوری کے لئے آمادہ کرتی ہیں اور اس جوش و طنطنہ سے کہتی ہیں کہ ؎

جعفر سے نمودار کے دلبر ہو دلیرو
حیدرؑ سے دلاور کے دلاور ہو دلیرو

جرار ہو کرار ہو صفدر ہو دلیرو
ضرغام ہو ضیغم ہو غضنفر ہو دلیرو

تیروں سے جوانوں کے جگر توڑ کے آؤ — خیبر کی طرح کوفہ کا در توڑ کے آؤ
خندق کی لڑائی کی طرح جنگ کو جھیلو — بچے اسد اللہ کے ہو جان پہ کھیلو
تیغوں میں دھنسو چھاتیوں سے تیروں کو رولو — کوفہ کو تہ تیغ کرو شام کو لے لو
دو اور جِلا آئینہ تیغ عرب کو — لو روم کو قبضے میں تو قابو میں حلب کو
خاقان کا رہے تخت نہ قیصر کا رہے تاج — ہاں غازیو چین و حبش و زنگ سے لو باج
چڑھتا ہے لڑائی پہ جوانمردوں کا معراج — گیتی تہ و بالا ہو وہ تلوار چلے آج
میلے نہ ہوں تیور یہ سپاہی کے ہنر ہیں — جس کے ہیں لبِ اس کے ہیں جب ہر ہیں پس اُدھر ہیں
گہ عطر میں ڈوبے ہیں گہے خون میں تر ہیں — صحبت میں مصاحب ہیں لڑائی میں سپر ہیں
دہ اور کسی سے نہ جھکیں گے نہ جھکے ہیں — عزت میں نہ فرق آئے کہ سر بیچ چکے ہیں

عون و محمد کی لڑائی کا بیان میرانیس کے رزمیہ کارنامہ کا ایک جزو لاینفک ہے جس کے بغیر ان کی رزم نگاری مہتم بالشان نہیں کہلائی جا سکتی، حضرت زینبؑ دم بدم بیٹوں کی جنگ کی خبریں منگاتی ہیں اور جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستقل مزاجی سے لڑ رہے ہیں تو ؎

سن کر یہ بیان شاد ہوئیں زینبؑ خوشخو — پر جوشِ محبت سے رہا دل پہ نہ قابو
ہر بی بی سے ارشاد کیا پونچھ کے آنسو — میدان سے سرکے نہیں اب تک مرے گلرو
لاکھوں سے لڑے تشنہ دہن کام کیا ہے — سنتی ہوں کہ چھوٹے نے بڑا نام کیا ہے

آخر کار دونوں لڑکے اپنی ماں کی نصیحت کے مطابق ایک تہلکہ انداز لڑائی کے بعد جان دیدیتے ہیں اور جب ماں کو ان کی شہادت کی خبر ہوتی ہے تو بجائے آہ وزاری کے ؎

یہ سنتے ہی قبلہ کی طرف جھک گئیں زینبؑ — سجدہ سے اُٹھیں جب تو کہا شکر ہے یا رب
طالب تھی میں جس کی وہ بر آیا مرا مطلب — سب مٹ گئے دھڑکے کوئی تشویش نہیں اب

لٹنے سے محمدؐ کی کمائی کو بچالے ۔ سب قتل ہوں پر تو مرے بھائی کو بچالے

کس منہ سے ترا شکر کروں بارِ خدایا ۔ تو نے مرے دو بچوں کو پروان چڑھایا
گر بیاہ فلک نے نہ دکھایا نہ دکھایا ۔ جو مرتبہ اعلائے شہادت ہے وہ پایا
عالم میں جو دکھ ان کے لئے میں نے بھرے ہیں ۔ تو رحم کر ان پر کہ یہ مظلوم مرے ہیں

اور جب دوسری عورتوں کو آہ و زاری کرتا ہوا دیکھتی ہیں تو اس پر حضرت زینبؑ سا صابر اور مستقل مزاج زینبؑ تعجب کرتی ہیں کہ یہ کونسی بڑی اور نئی بات ہوی ہے جس کے سبب اس قدر آہ و کہرام کی ضرورت ہے چنانچہ تمام بیویوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں ؎

باپ ان کا اگر ہوتا تو وہ سر نہ کٹاتا؟ ۔ زہراؑ کے کلیجے کے عوض برچھیاں کھاتا
بیٹوں کو یوں ہی میری طرح نذر کو لاتا ۔ اپنے کوئی محسن کو نہیں دل سے بھلاتا
جو پاس ہے جس کے وہ عطائے شہ دیں ہے ۔ کہدے مرے ماں جائے کا حق کس پہ نہیں ہے

بیٹوں سے ہوی گر تو ہوی آج جدائی ۔ سر پہ مرے دنیا میں سلامت رہیں بھائی
ایک دولت اولاد لٹائی تو لٹائی ۔ کیا لٹ گیا وہ کونسی ایسی تھی کمائی
کیا روؤں میں دنیا میں جو دلبند نہیں ہیں ۔ کیا اکبر و اصغر مرے فرزند نہیں ہیں

ایثار اور محبت کی بھی ایک حد ہوتی ہے! حضرت زینبؑ کی تشفی کے لئے یہی بہت کافی ہے کہ امام حسین، اکبر اور اصغر ابھی زندہ ہیں، جن کی موجودگی میں ماتمی صف کا نام تک لینا انھیں ناگوار گزرتا ہے ؎

چلائی ارے چپکے رہو غل ہے یہ کیسا ۔ بھائی ہیں سلامت مجھے کیوں دیتے ہو پُرسا
ہے ہے نہ کرو صاحبو! گھبرائیں گے شبیر ۔ پھر کوئی ہے زینب کا جو مر جائیں گے شبیر

تم روتے ہو کس واسطے میں تو نہیں روتی ۔ دامانِ مژہ بھی نہیں اشکوں سے بھگوتی

دل ہوتا جو ایسا ہی تو کیوں بیٹوں کو کھوتی　　　دولت کوئی ماں جائے سے پیاری نہیں ہوتی
قائم رہے اقبال محمدؐ کے خلف کا　　　بس نام بھرے گھر میں نہ لو ناموں صف کا

امام حسینؑ اور علی اکبر دونوں لاشوں کو میدان جنگ سے خیمہ میں لے آتے ہیں تو حضرت زینبؑ سب سے پہلے بھائی سے ان کی لڑائی کے متعلق دریافت کرتی ہیں اور جب امام حسینؑ سے انکی بہادری اور جرأت کی بے حد تعریف سنتی ہیں تو ؎

یہ سنتے ہی سرخی سی رخ زرد پہ آئی　　　حضرت سے کہا آپ کا صدقہ ہے یہ بھائی
کونین میں عزت مرے دلبندوں نے پائی　　　اب شاد ہوئی ان سے یداللہ کی جائی
آقا مجھے پیار آتا ہے اقبال پہ ان کے　　　بیکس ہیں خدا رحم کرے حال پہ ان کے

آخر ماں ہی ہیں، اب ان کا دل بھر آتا ہے، جب لوگ انھیں بچوں کا آخری دیدار دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں تو ان کی انسانیت کی سوتیں ایک دم ابل پڑتی ہیں تاہم صبر سے کام لے کر ؎

فرمایا میں نہ جاؤں گی بچوں کی لاش پہ　　　. . . . .
آنچ آتا کی دل کو جلائے تو کیا کروں　　　گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں
بس سن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے　　　لاشوں پہ لاشے لوٹ چکیں کھیت پڑ چکے
کنبہ تمام ہو چکا دو گھر اجڑ چکے　　　گودوں میں جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے
اب ان کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہیے　　　بی بی سلامتی علی اکبرؑ کی چاہیے
روؤں گی میں تو پھر علی اکبرؑ بھی روئیں گے　　　صدمہ مجھے یہ ہے کہ برادر بھی روئیں گے

لیکن جب بچوں کے لاشوں کو دیکھتی ہیں تو بے ہوش ہو جاتی ہیں آخر صبر کی کوئی حد بھی ہوتی ہے، انسان، پھر عورت اور وہ بھی وہ جس کے دونوں بچے آنکھوں کے سامنے مار ڈالے گئے ہوں اگر متاثر ہوئے بغیر رہ سکے تو فوق الفطرت بات ہوگی۔ حضرت زینبؑ کو جب ہوش آتا ہے

تو انھیں اپنے بچوں کے کفن دفن کی فکر نہیں ہوتی بلکہ ؎

ہوش آیا تو اکبرؑ سے کہا رانڈوں کو سمجھاؤ　　ہے ہے نہ کرو صاحبو اک لحظہ ٹھہر جاؤ
عباسؑ کی زوجہ سے یہ بولیں کہ اِدھر آؤ　　کیا روتی ہو کپڑے علی اکبرؑ کے بدلواؤ
بانو ہیں کدھر آہ یہ کیا بے خبری ہے　　سب خون سے مرے لال کی پوشاک بھری ہے

ایثار اور محبت کی انتہا ہے کہ اپنے بچے تو مرے پڑے ہیں لیکن زینبؑ کو علی اکبرؑ کی فکر لگی ہوئی ہے، انھیں یہ برا معلوم ہوتا ہے کہ بن بیاہے علی اکبرؑ نے ان کی لاشیں کیوں اٹھائیں، ان کی نسائیت کا اقتضا تھا کہ اس موقع پر وہ عورتوں کے عام اوہام سے بری نہ ہوئیں، چنانچہ اس وقت انھیں ایک معمولی عورت کی طرح وسواس ہوا مگر یہ وسواس ایک گہری محبت کا نتیجہ ہے ؎

زینبؑ نے کہا کیوں مجھے وسواس نہ آئے　　ہے ہے علی اکبر اُسے کیوں گود میں لائے
لوگو مرے پیارے نے بڑے رنج اٹھائے　　صدقے یہ پھوپی لاش کے لے آنے کے جائے
دو روز سے وہ سرورِ واں تشنہ دہاں ہے　　اس بوجھ کی طاقت مرے بچے میں کہاں ہے

ان دونوں نے گر جان گنوائی تو گنوائی　　بن بیاہے مرے لال نے کیوں لاش اٹھائی
میں ماں ہوں نہ صاحب مجھے یہ بات نہ بھائی　　اکبرؑ مری اٹھّارہ برس کی ہے کمائی
دل سے نہ یہ داغ الم و یاس مٹے گا　　صدقہ اب اُتاروں گی تو وسواس مٹے گا

حضرت زینبؑ امام حسینؑ کے بچوں بالخصوص علی اکبرؑ کی عاشق زار تھیں اور اس قدر محبت کرتی تھیں کہ اکبرؑ کا رونا تک انھیں پسند نہ تھا، اپنے ہر کام میں وہ علی اکبرؑ کا لحاظ رکھتی تھیں جب نیا چاند نکلتا تھا تو پہلے انہی کا چہرہ دیکھتی تھیں، اپنے بچوں اور شوہر کو بھی ہمیشہ ان کا خادم سمجھتی تھیں، ایسی صورت میں وہ کب گوارا کر سکتی تھیں کہ علی اکبرؑ عون و محمدؑ کی لاشیں لے آئیں۔

یہاں تک تو انیسؔ نے حضرت زینبؑ کو ایک عربی شکل میں پیش کیا تھا، اس کے بعد جب

بین شروع ہو جاتے ہیں تو وہ ایک ہندوستانی فطرت رکھنے والی عورت بن جاتی ہیں اور چونکہ مرثیوں کی ظاہری کامیابی کے لئے اس عنصر کا شامل کرنا لازمات سے تھا، اس لئے انیس نے اس سے خاطر خواہ کام لیا ہے اگرچہ اس امر میں وہ بعض جگہ جادۂ اعتدال سے متجاوز ہو گئے ہیں لیکن یہ کوئی ایسا بڑا نقص نہیں ہے کہ اس کے وجہ سے ان کے شاندار شہ کاروں کی حقیقی قدر و منزلت میں کسی قسم کی کمی واقع ہو سکے۔

الحسنات یذھبن السیّئات

ہوریس اسمتھ کی شاعری کا نمونہ

(۱)

ہوریس اسمتھ

(۱۷۷۹ تا ۱۸۴۹ء)

سوانح نگاری کی ضرورت نہیں مہتم بالشان ہستیوں کی زندگی کے نمایاں واقعات کو تاریخ پیدایش اور تاریخ وفات کے شمول کے ساتھ بائیں شائستہ قلمبند کر دینا قابل صد تحسین و آفریں ہرگز نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انشا پرداز کے اُن نقوش تاثر کو دکھایا جائے اور بوجوہ احسن دکھایا جائے جو اس کی مصنفات کے عمیق مطالعہ کے بعد دل پر اور صرف دل پر ثبت ہو جاتے ہیں۔

مصنف اپنے مخصوص زمانے کی پیداوار ہوتا ہے ماحول کے امیال و جذبات اور سوسائٹی کے معتقدات و توقعات کی صحیح ترجمانی کرنا اس کا بہترین فرض ہے اس کے کارناموں میں انسانی ذہنیات مرتقیہ کے لب لباب اور حقیقت الحقایق کی جھلکوں کا پایا جانا اس کی کامگاری کی لائق امتنان سند ہے۔

علمائے قدیم و جدید نے شجر اخلاق کی جن جن شاخوں کو بارآور تبلایا ہے ان میں سے

ہر ایک بلا استثنا، جغرافیائی تغیرات کی متحمل ہو سکتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام انسانی کائنات میں جذبات و خواہشات ایک ہی رفتار سے اور ایک ہی طرز میں سرگرم فرمانروائی ہیں لیکن بعض بعض اذہان مرتقیہ کے خاص خاص لطائف و دقائق اور تاثرات و وجدانیات کو ترتیب و تنظیم کی فضائے محدود میں محصور کرنا سطح آشنا آنکھوں کا کام ہے۔

ہوریس اسمتھ کا دماغ جن جن محسوسات اور تخیلات کا جولانگاہ ہوگا ان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہم نہیں لگا سکتے ہاں خود اس کی مصنفات اپنی زبان بے زبانی سے اپنے صناع کے محاسن و قبائح کلام پر تنقید کرنے کی مجاز ہیں گو پرعظمت شخصیتوں کے حالات اور سوانح زندگی اکثر ان کی بیوگرفی اور سوانح عمریوں سے معلوم کئے جاتے ہیں، لیکن خود مصنف کا قلم اس کی تصنیفات میں جو اس کا کامل مرقع کھینچتا ہے وہی حقیقی اور اصلی ہوتا ہے دوسروں کے قلم صرف اس کے ظاہری خط و خال کا خاکہ کھینچ سکتے ہیں، لیکن قلب کی گہرائیوں میں جو رموز و اسرار مضمر ہیں ان کی تصویرکشی کے لئے جن رنگوں کی ضرورت ہے ان کا دوسروں کو میسر آنا دشوار ہے جب کسی کتاب کا آپ مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مصنف کی ذات غیر مضمر طور پر اس میں اپنی جھلکیاں دکھا رہی ہے گویا تصنیف ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں مصنف مع اپنی قلبی گہرائیوں کے نظر آجاتا ہے، اور وہی تصنیف زیادہ مقبول و محمود ہوتی ہے جس میں مصنف اپنے نفس کی چوریاں اور قلبی نفاق کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب کبھی وہ کچھ بول اٹھتا ہے تو دوسروں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہی کے دلی رازوں کو فاش کر رہا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہوریس اسمتھ کے ماحول کا کماحقہ مطالعہ جس زاویہ نگاہ سے کرنا چاہئے اس وقت کمی گنجائش کے سبب یا طوالت بیان کی وجہ سے نہیں کیا جا سکتا کاربرآری کے طور پر اس امر کا اظہار ضروری ہے

کہ ہوریس کی پیدائش ایک ایسے مقام پر ہوتی ہے جس کو باعتبار جامعیت حالات تمام دنیا کے شہروں پر تفوق شرف حاصل ہے وہ کون؟ برطانیہ عظمیٰ جیسی رفیع الشان اور مطلق العنان سلطنت کا پایہ تخت قومی وملکی ادبیات کا محور، اور بین الاقوامی لسانیات کا مرکز، یعنی لندن، اسی گہوارۂ علمیات وادبیات کے تاثرات سے ہوریس کی غیر معمولی انفعالیت نے اس کو فنون لطیفہ کے اعلیٰ وارفع شعبوں سے متکیف اور لذت اندوز ہونا سکھایا۔

یہاں یہ بھول جانا ناانصافی ہوگی کہ اس کام میں اس کے خانگی حالات نے بھی اس کو بیحد مدد دی یعنی وہ ایک ایسے گھر میں پیدا ہوا تھا جس کا رب البیت دارالحکومت انگلستان کا ایک معزز اور مشہور وکیل اور بورڈ آف آرڈی ننس کا سولیسٹر رابرٹ اسمتھ تھا جس نے اپنے دو نو بیٹوں جیمس اور ہوریس کو ان کی ذوقیات ادب کی نشو ونما میں بائین شائستہ مدد دی۔

ہوریس اور اس کے بڑے بھائی جیمس اسمتھ کے ناموں میں چولے دامن کا سا تعلق ہے دو نو نہایت ہوشیار، ظریف، طباع اور دلچسپ انشا پرداز تھے نظم اور نثر ہر دو جولانگاہوں میں اپنے ہنر کی بازیاں دکھلائیں اور متفرق زبانوں نے تحسین وآفرین کے خزانوں سے ان کے دامن کمال کو بھر کر اپنی قدردانی کی داد حاصل کی۔

ایلکس کے ایک مدرسہ میں تعلیم پانے کے بعد بڑے بھائی نے تو اپنے باپ کے ساتھ وکالت شروع کردی اور ہوریس ادبیات سے لطف اندوزی میں محو ہوگیا دونو کو لندن شہر سے خاص اُنس تھا اس امر کا تصفیہ کہ آیا ڈاکٹر جانسن کو لندن سے زیادہ تعلق خاطر تھا یا اُن دونو بھائیوں کو، ذرا دشوار امر ہے، ڈاکٹر جانسن کا مشہور مقولہ ان کے ورد زبان تھا کہ "جناب جو شخص لندن سے بیزار ہے گویا زندگی سے بیزار ہے"۔

ان دونو بھائیوں کی اولین ادبی خدمات مضامین کی شکل میں ایک رسالہ "پک نک"

میں ظاہر ہوئیں اور بعض بہترین مضامین ایک دوسرے رسالے میں (NewMonthly-Magazine-) جو ٹامس کیمپ بل کی زیر ادارت شائع ہو رہا تھا) نکلے "ریجکٹیڈ اڈریسیس" ان دونو بھائیوں کی چھ ہفتہ کی متفقہ مشغولیت کا نتیجہ ہے ۱۸۱۲ء عیسوی میں اسی مجموعہ کے ذریعہ ان دونو نے شہرت جاودانی حاصل کرلی اور اس کے بعد ہی انگلستان کے لائق لائق انشا پردازوں کی نظریں ان کی طرف اٹھنے لگیں۔

اس مجموعہ کا شان نزول یہ ہے کہ ڈروری لین تھیٹر کی کمیٹی نے ایک انعامی اڈریس کا اعلان کیا جو اس عمارت کی افتتاح کے وقت پڑھا جانیوالا تھا ان دونو بھائیوں نے بھی اسکی کوشش کی لیکن ناکام رہے لارڈ بیرن کا اڈریس موقع پر پڑھا گیا جس سے متاثر ہو کر انھوں نے اس وقت کے پسندیدہ مصنفین کے اسالیب بیان کی تقلید میں متفرق اڈرس لکھے جن کو شائع کرنے کے بعد اتنی قدر ہوئی کہ فوراً بائیس اڈیشن ہاتوں ہاتھ خرید لئے گئے۔

جیمس نے چند اور سال تک اپنے بھائی ہوریس کا ادب کی خدمات میں ہاتھ بٹا کر آخرکار خود کو وکالت کے لئے وقف کر دیا ہوریس سے بھلا اس شراب کا چسکہ کیا چھوٹنے والا تھا؟ وہ اپنے بھائی کے انتقال سے دس سال بعد تک بھی (یعنی اپنی وفات موقوعہ ۱۲ جولائی ۱۸۴۹ء تک) اسی میں بالکل محو رہا اس کی ایک ناول (BrombletyeHouse) اپنی نوعیت کے لحاظ سے اسکاٹ کی اکثر ناولوں کی برابری کا دعویٰ کرسکتی ہے اس کے نظمیہ کارناموں کو کولبرن نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔

ہوریس، ڈاکٹر جانسن۔ سر والٹر اسکاٹ۔ مور۔ اور فٹزجرلڈ کا مقلد ہے گو اس کی (اور اس کے قابل بھائی کی بھی) اکثر مصنفات بہت کچھ اہمیت رکھتی ہیں لیکن نمایش بلزدنی کے ممی کو مخاطب کرکے اس نے جو نظم لکھی ہے وہ نہ صرف مطالب کی فراوانی اور خوش طبعی و ظرافت

کے ساتھ جوش وجذبات کی ہم آہنگی سے مالامال ہے بلکہ اپنے اسلوب بیان کی خوبیوں اور زبان کی پاکیزگیوں کی وجہ سے بھی زیادہ قابل قدر ہے نیز اس میں شاعری کے وہ تمام مسلمات جلوہ گر ہیں جن کے ذریعہ ہم کسی شاعر کے خاص مطمح نگاہ اور منتہائے نظر کو معلوم کر سکتے ہیں۔

کسی کا قول ہے " شاعر کے آگے جب کوئی چیز آتی ہے تو وہ معلوم شدہ اور بے نقاب آتی ہے" ہوریس کے آگے گو می ایک طلسمات اشکال اور مجسمہ معمہ بنکر کھڑا ہے لیکن شاعر وجدان حقائق پر قابض رہتا ہے اس کی نگاہ حجابات ظاہری کو چیرتے ہوئے اسرار فطرت کی ان گہرائیوں تک بھی پہنچ جاتی ہے جو بیگانہ تخیل کے دائرۂ نظر سے بالکل باہر ہوتی ہیں اگر شاعر ہماری ساری حیات مدنی اور ارتقائے روحانی کے ماضی، حال اور مستقبل تک کافی نگاہ نہیں دوڑا سکتا تو جس طرح آفتاب کی شعاعیں دنیا کے ہر حصہ کو متاثر کر سکتی ہیں (گو ان پر بالراست پڑنے سے قاصر ہوں) شاعر پر بھی جملہ کائنات کی چیزیں منکشف ہوتی رہتی ہیں اس کا یہ دعویٰ بالکل حق بجانب ہے کہ

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں   ہم سے کہاں چھپینگے وہ ایسے کہاں کے ہیں

می کو دیکھتے ہی ہوریس اسمتھ کا دماغ محشر خیال بن جاتا ہے گنجفہ باز کی نظروں کی طرح اس کے ذہن کے آگے گونا گوں تصویریں اور عجیب عجیب مرقعے پھر جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اعلائے فکر، رفعت تخیل اور وسعت مطالب کی سرجوین ستو میں ایک دم ابل پڑی ہیں ایک کتب خانہ میں جانے کے بعد بھی ہوریس کا یہی حال ہوتا ہے اسی عنوان پر اس نے ایک مضمون نثر میں لکھا ہے جس کا کچھ ترجمہ صرف اس مقصد سے یہاں پیش کیا جاتا ہے کہ ہوریس کی صحت مذاق کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جا سکے لکھتا ہے:۔

(۲)

کتب خانہ

معلوم نہیں کتنے مشقت آمیز ایام، کتنی دماغ پاشیاں، کس قدر چراغ نیم شبی کے آگے کی خواب فراموشیاں، کتنی امیدیں اور مایوسیاں کس قدر سخت مطالعہ کی طویل زندگیاں یہاں چھاپے کے ذریعہ رفیع الشان بنادی گئی اور ان الماریوں کی تنگ فضا میں محدود کردی گئی ہونگی ازمنہ ماضیہ کا کیا ہی خلاصہ ہے! اور وہ کیا ہی تغیرات آمیز قسمت ہو گی جس کی وجہ سے ان میں سے بعض محفوظ رہ گئے ہوں گے جب کہ دوسرے ان سے زیادہ قابل قدر بالکل ہی برباد ہو چکے زمانہ گذشتہ کے بعض بیش بہا خزانے گرد آلود اور مکڑی کے جالوں میں گھرے ہوئے گرجا کے کتب خانوں، ذخیرہ گھروں، پادریوں کے اسباب خانوں اور تہ خانوں سے نکالکر محفوظ کئے گئے بعض زمین کھودنے کے بعد لوہے کے صندوقوں میں پائے گئے یا مذہبی مباحثوں کی بڑی بڑی اور وزنی جلدوں کے نیچے سے نمودار ہوئے یا وعظوں اور خطبوں کے پشت پر سے نقل کر لئے گئے ہیں جن پر ان کو لکھنے کے چمڑوں اور جھلیوں کی کمی کے سبب قلم بند کر لیا گیا تھا اگر ہمارے کثیر التعداد انشا پردازوں میں سے کوئی کسی قدیم مصنف کی دوبارہ پیدایش کے پُر از مہمات بیانات کو یا قدیم فن بت تراشی کے کسی مشہور کارنامے کی یافتگی کے مفصل معلومات کو ضبط تحریر میں لائے تو کیا ہی دلچسپ کتاب تیار ہو جائے۔

گو لاتعداد ہی صحیح، لیکن وہ کتابیں جن کو ہم نے محفوظ کر لیا ہے کتنی ہیں بہ نسبت ان کے جو مفقود ہو چکی ہیں؟ جس نسبت کے ساتھ بنی نوع انسان کی مردہ نسلیں موجودہ قوموں سے بڑھ سکتی ہیں اس سے بہت زیادہ نسبت کے ساتھ گم شدہ کتابیں موجودہ کتابوں سے بڑھ جاتی ہیں

انسان فطرتاً عجلت نگار ہے اور فن کتابت یا طرز تحریر کے یوم الایجاد سے آج تک ہر زمانہ میں ہمارے خیال کردہ تخمینہ سے بہت زیادہ ادبیات کی پیداوار ہوتی رہی ہے ....

ایک گمنام کتاب اپنی آدھی دلچسپی سے محروم ہوجاتی ہے وہ ایک غیر معلوم ہستی کی آواز بادلوں کی ایک گرج، ایک اجنبی شئے کا سایہ اور ایک ایسی بیگانہ چیز ہوتی ہے جس کو بنی نوع انسانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہر شخص کسی مصنف کو اس کے مرنے کے بعد اس کی تاریخ پیدائش سے لیکر تاریخ وفات تک کے حالات کے ذریعہ نیز اس کی پسماندہ دماغی اولاد کو سوانح عمریوں اور تذکروں کے مدد سے معلوم کرنا چاہتا ہے ایک من گھڑت نام بھی گمنام ہونے سے بہتر ہے حالانکہ یہ علانیہ دھوکہ بازی اور اپنی شخصیت کو ایک غیر ہستی میں محو کردینا ہے ....

اگر ہم اس قسم کی وہمی شخصیت سے زیادہ حقیقی کوئی ادبی حیثیت قائم کرلیں اور کسی مقبول عام رسالہ میں کسی خاص لقب کے ساتھ مضامین شائع کرنے لگیں تو بھی اس کی کیا اہمیت؟ صرف یہی ...... ایک مہینہ کی بقا جس کے بعد ہمیشہ کے لئے فراموشی کے سرسبز باغات کی تفریح کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائیگا خود ہماری تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہے ہم سایوں کی طرح ظاہر ہوتے اور پھر غائب ہوتے ہیں بعض بعض اوقات کوئی مہربان لیکن دل جلا سوانح نگار ہمارے بہترین مضامین کو "رسالوں کی خوبصورتیاں" یا "موجودہ رسالوں کی روح" یا کوئی اور برقانے والی ترکیبوں کے عنوان سے دوبارہ شائع کرکے ہمیں محیط نسیاں سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن افسوس وہ بھی ایک وسیع بحر مواج کے اس پیراک کی طرح ہے جو اپنے ڈوبتے ہوئے ساتھی کو بچانے کی سخت جد وجہد کرتا ہے مگر صرف چند ہی لمحوں کی مہلت کا باعث بن سکتا ہے حالانکہ اس کے بعد

دونو فراموشی کی موجوں میں غرق ہو جاتے ہیں"۔

اس عبارت کے مطالعے کے بعد ہوریس اسمتھ کی تخلیقی قوت کے متعلق ہمارے پیش کردہ خیالات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتے ہیں نیز آئندہ صفحوں میں اس کی نظم کا ملاحظہ کرنے کے بعد ناظرین غالباً اچھی طرح سے واقف ہو جائیں گے کہ اس کے محسوسات وجذبات کس بوستان زار جاؤ پر سیر و تفریح کرنے کے عادی تھے؟ اس کا دماغ کن کن تخیلات کا گہوارہ تھا؟ اور اس کے حواس و مدرکات میں کس قسم کی جودت تھی؟ یہ تھا مختصر سا بیان جس کے ذریعہ ہم نے حتی الامکان اپنی انفعالیت تخیلات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۳)

نظم کی تلمیحات

ابتدائے آفرینش سے آج تک کے انسانی کاروبار پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد جو بین نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ انسانی فطرت کا عام میلان ایک ہی چیز کے حصول کی طرف رہا ہے یعنی بقا تاریخ عالم کے صفحات اس قسم کے مواد سے موفور ہیں ہر قوم اور ہر ملک نے اپنی اپنی بساط عقل وادراک کے موافق اس بات کی لگاتار کوشش کی ہے کہ کوئی نہ کوئی ذریعہ ایسا ہاتھ لگ جائے جس کی مدد سے وہ اپنے کو فنا کے زبردست اور غیر فانی پنجوں سے چھڑا سکے اور بقائے دوام حاصل کرے افسوس آج تک انسان اپنی اس قسم کی کوششوں میں بالکل ناکام ہے لیکن ع

بیکار کسی شخص کی محنت نہیں جاتی

اس جدوجہد میں اتنا نتیجہ ضرور نکلا کہ انسانی کارنامے دنیا میں اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو مدت مدید تک ضرور باقی رہنے کے قابل بن گئے۔

موجودہ روشن زمانہ کی حیرت انگیز اور ہوش ربا ایجادات سے بہت زبردست امید تھی کہ وہ ضرور اس ابدی خواہش کے پورا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

یورپ کوئی نئی بات معلوم کرنی تو کجا مصر کے قدیم باشندوں کے اس طریقے کو بھی معلوم نہ کر سکا جس کی وجہ سے اس عظیم الشان قوم کو اس بات کا فخر حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے مردوں کو ہمیشہ کے لئے اگر ہمیشہ کے لئے کہنا مبالغہ نہ ہوگا) زمانہ کی دست برد اور فنا ہونے سے بچا لیتے تھے انہی محفوظ مردوں کو ممی کہتے ہیں اس قسم کے مردے مصر کی قدیم سرزمین سے نمودار ہوتے رہے اور آج کل کی تحقیقات کے ذریعہ تو وہ مع اپنے سامان آرایش اور اشیائے خورونوش کے دنیا کے روبرو گویا دوبارہ زندہ ہو رہے ہیں۔

مشہور نمایش بلزونی میں ایک ایسا ہی ممی پیش کیا گیا تھا جس سے متاثر ہو کر ہوریس سمتھ نے یہ نظم لکھی تھی اس میں شاعر ممی کو مخاطب کر کے گذشتہ زمانے کے ان واقعات کی حقیقت دریافت کرتا ہے جو بہت ہی قدیم زمانے میں گزرے ہیں اور قدامت کی وجہ سے ان کے متعلق شبہات اور اختلافات پیدا ہو گئے ہیں نیز جو بہت ہی مشہور ہیں اور جن کے متعلق شاعر کا خیال ہے کہ وہ غالباً ممی کے آنکھوں دیکھے ہوں گے اس لئے ان کے متعلق ممی کا بیان قابل اعتبار ہوگا کیونکہ

ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

ممی کو دیکھتے ہی سب سے پہلے شاعر کو جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ممی مصر کے پایہ تخت کا باشندہ ہوگا اس نے اس عظیم الشان شہر کی تمام گلیاں چھان ڈالی ہوں گی اور اس کی ان تمام گم شدہ عظمتوں اور دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوا ہوگا جن کا ذکر تمام تاریخوں میں مصر کی عظمت قایم رکھنے کے لئے اب تک موجود ہے تھیبس شمالی مصر کے پایہ تخت کا یونانی نام ہے جس کو مصری

زبان میں غالباً ویسی یا ذیمی کہتے تھے بیوشیا (علاقہ یونان) کے مشہور شہر تھیبس کے نام پر (جو ایتھنس سے چوالیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے) یونانی اس کو بھی تھیبس کہنے لگے ہومر نے اپنی الیڈ میں اس کو "سو دروازے والا" بیان کیا ہے یہ شہر پہلے پہل رودنیل کے مشرقی کنارے پر آباد ہوا لیکن بعد میں جب عالیشان منادر، خوبصورت باغات اور شاہی محلات کی فراوانی ہونے لگی تو نیل کے مغربی کنارے بھی اس کے دامنوں میں وقف ہو گئے جہاں ممنن کا عالیشان مجسمہ اپنے بلند و دلچسپ مندر کے دروازے پر کھڑے رہ کر آنے جانے والوں پر نظر رکھا کرتا تھا تھیبس کے مندروں میں سب سے زیادہ عالیشان عمارت مندر کرنک کی تھی مصر کے ہر بادشاہ نے اپنے دارالقرار کی شان و شوکت میں ترقی دینے کی حتی الامکان کوشش کی فرعونی خاندان کے تھمند ہر لڑائی کے بعد لاتعداد غلام اور لونڈیاں لاتے اور اپنے شہر کی رونق اور آبادی بڑھاتے یہ حالت رامس دوم کے زمانے تک جاری رہی جس کے بعد ہی سے تھیبس کی بربادی شروع ہو گئی

ممنن نام ایک مشہور شخصیت ہومر شاعر کے زمانے سے بہت پہلے گزری ہے جس کے کارناموں اور مہمات کی تعریف میں متفرق یونانی شاعروں نے نظمیں لکھی تھیں کہا جاتا ہے کہ اس نے سوسہ کے شاہی قلعہ کی بنا ڈالی تھی جو بعد میں اسی کے نام پر ممنونیم مشہور ہو گیا نیز تھیبس کے قریب انبائس وسوم کے چند مجسمے بنے ہوئے تھے جن میں سے دو اب بھی باقی ہیں ان کو بھی ممنونیم کہا جاتا ہے ان میں سے بڑے مجسمے کے متعلق مشہور ہے کہ ہر صبح جب آفتاب کی شعاعیں مجسمہ پر پڑتیں تو وہ موسیقی کے مطابق آوازیں پیدا کرنے لگتا ان نغموں کی عجیب عجیب طرح سے تاویلیں کی جاتی ہیں یہ مجسمہ ستائیسویں صدی قبل مسیح کے زلزلہ میں ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جب اس کو دوبارہ بنایا گیا تو اس کی آوازیں بند ہو گئیں اس نظم میں شاعر نے ممی سے دریافت کیا ہے کہ ان نغموں کی جن کے متعلق ہوشربا داستانیں مشہور ہیں حقیقت کیا ہے؟

ابوالہول ایک عجیب الخلقت خیالی جاندار کو کہتے ہیں جس کے مجسموں میں انسان کے سر کے ساتھ شیر ببر کے جسم بنائے جاتے تھے یونانی ابوالہول کو پھوٹے بھی ہوتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا مصر سے ہوئی اس لئے کہ وہاں دیوتاؤں کو عجیب عجیب شکلوں میں ظاہر کیا جاتا تھا ان مجسموں میں کبھی کسی جانور کے جسم کو آدمی کا سر لگا دیا کرتے تھے اور کبھی آدمی یا عورت کے جسم کے ساتھ کسی جانور کا سر لگا دیتے تھے یونانی روایتوں میں سب سے زیادہ مشہور ابوالہول تھیبس کا تھا۔ جس کا چہرا عورت کا دم اور بہیر شیر ببر کے اور پھوٹے پرند کے تھے اسی کی طرف نظم میں اشارہ کیا گیا ہے۔

سفری نس اور کیف کا ذکر ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ میں کیا ہے کیف کو مصر کے اہرام کا بانی قرار دیا جاتا ہے ایک زمانہ تک امن و امان کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد اس نے اپنے عہد کی یادگار قائم رکھنے کے لئے دس لاکھ مصریوں کو اہرام کے بنانے میں مصروف کیا۔ سفری نس کیف کے بعد کا فرمانروا تھا اس نے اہرام کی تعمیر جاری رکھی جو اس کے جانشین مای سی رنیس کے زمانے میں اختتام کو پہنچی ہیروڈوٹس نے ان کے واقعات بیان کرنے میں غلطیاں کی ہیں جن کی وجہ سے اہرام مصر کے متعلق بعد میں چل کر بہت سے شبہات ہونے لگے انہی شبہات کو شاعر می کے بیان رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اہرام مصر مربع چبوتروں پر انیٹ یا پتھر کے بنے ہوئے ہیں چار ہزار سال قبل مسیح سے دو ہزار قبل مسیح تک تقریبًا چالیس اہرام کی تعمیر ہوئی ان میں سب سے مشہور مجموعہ غزہ کا ہے جو قاہرہ کے شمال میں چند ہی میل کے فاصلہ پر واقع ہے ان میں سب سے زیادہ مشہور کیف کا ہے جو چالیس فٹ اونچا ہے اور سب سے بڑا ہے متفرق حملہ آوروں نے تحقیقات کی خاطر انھیں توڑ پھوڑ ڈالنے کی کوشش کی لیکن ان کی غیر معمولی مضبوطی نے انھیں اب تک بچائے رکھا ہے۔ پاپی کا منارا اسکندریہ میں ہے جس کو ٹلیمی نے شاہنشاہ ڈیاکلی ٹین کی پرستش کے

بنایا تھا اس پر اسکندریہ کی ۲۹۶ کی فتح کا کتبہ ہے اس کو منار پامپی کہلانے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اسکندریہ میں رامسس دوم کے قائم کردہ ہلیاپولس (Helia Polis.) کے کتبہ کو "قلوپطرہ کی سوئی" کہلانے کا حق ہے یا کوہ جبرالٹر کو "منار ہرکولیس" کہلانے کا۔ منار پامپی .افٹ بلند ہے اور سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے شاعر ممی سے اس امر کی حقیقت دریافت کر رہا ہے کہ درحاصل اس منار کو پامپی سے منسوب کرنا صحیح ہے یا کیا ؟

ہومر یونان کا رزمیہ نگار شاعر ہے اس سے بہت سی کتابیں منسوب کی جاتی ہیں مگر افسوس کہ وہ اس وقت مفقود ہیں صرف حسب ذیل موجود ہیں :۔

(ا) دو مہتم بالشان رزمیہ کتابیں یعنی الیڈا اور آڈسی ۔

(ب) تینتیس گیتیں ۔

(ج) ایک دلچسپ رزمیہ (چوہے اور مینڈک کی لڑائی) اور چند اشعار ۔

ہومر کے زمانہ کے متعلق کسی قسم کی کوئی روایت قابل اطمینان اب تک نہیں ملی ہرڈوٹس کا بیان یہ ہے کہ ہومر اور ہیسڈ دونو اس کے زمانہ سے چار سو سال قبل موجود تھے یعنی ۸۰۰ سال قبل مسیح شاعر ممی سے ہومر کے بیان کی تصدیق طلب کر رہا ہے ۔

شاعر کو ممی کی منجمد خاموشی دیکھ کر ہر قسم کا خیال پیدا ہونا ممکن ہے اس کے دماغ میں عجیب تخیلات کے پرے کے پرے اتر رہے ہیں جن میں سب سے پہلے جس بات کا خیال پیدا ہونا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اس خاموش انسان کو بات کرنے سے منع کر دیا گیا ہو جس طرح کہ فری میسن والے اپنے رازوں کو پردۂ اخفا میں رکھتے ہیں یا یہ کہ بعض مذہبی فرقوں کے کارکن لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ہر قسم کے اسرار کے حامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں شاعر ممی کی خاموشی سے سمجھتا ہے کہ وہ غالباً یا تو میسن ہوگا یا کم ازکم کوئی مذہبی کارکن ورنہ وہ اپنے حالات ضرور کہتا ۔

ڈیڈو کو الیسہ (Elissa) بھی کہتے ہیں وہ میٹن شاہ ٹیریہ (Meten) کی بیٹی تھی سیچربس (Cicharbus) کی بیوی اور کارتھیج شہر کی بانی تھی اس کے شوہر کو جب اس کے بھائی (Pygmalion) نے قتل کر ڈالا تو وہ قبرص بھاگ گئی وہاں سے ساحل افریقہ کا رخ کیا جہاں اس نے ایک زمیندار (Iarbus.) ایاربس سے کچھ زمین خرید کر شہر کارتھیج کی بنا ڈالی جب شہر ترقی کرنے لگا تو ایاربس نے اس کے پاس شادی کا پیام بھیجا اور کہا کہ اگر وہ انکار کرے تو لڑائی ٹھن جائے گی چنانچہ اس سے بچنے کے لئے ڈیڈو نے لوگوں کے آگے خودکشی کر لی اس کے بعد ڈیڈو کی باشندگاں کارتھیج نے پرستش شروع کر دی اس کے واقعات کے متعلق بہت اختلاف ہیں لیکن ہوریس اسمتھ نے ممی کو قدیم آدمی سمجھ کر یہ خیال کیا ہے کہ شاید کارتھیج میں ڈیڈو کی سواری کے تزک و احتشام کو دیکھ چکا تھا۔

شاعر کے تخیلات کی فضا بہت وسیع ہو جاتی ہے وہ مصر سے شام کی طرف بڑھتا ہے اور خیال کرتا ہے ممکن ہے کہ ممی بیت المقدس کی تعمیر کے بعد جب سلیمان علیہ السلام نے اس کو خدا کی دربار میں بطور نذر کے پیش کیا تھا اس تقریب میں شریک ہوا ہو اور مشعل ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو۔

رمیس اور رومیولس دونو سلویا کے بیٹے (Silvia) تھے روایات میں رومیولس کو شہر روما کا بانی اور پہلا بادشاہ قرار دیا جاتا ہے ان دونوں بچوں کو ان کے دشمن چچا نے دریائے ٹائبر میں بہا دیا تھا لیکن اتفاقاً یہ دونو ایک انجیر کے درخت کے پاس اس مقام پر آ ٹھہرے جہاں بعد میں چل کر انھوں نے شہر روما کو آباد کیا یہ انجیر کا درخت ایک زمانہ تک مقدس مانا جاتا تھا کہتے ہیں کہ ان دونو کو ایک مادہ بھیڑیا دودھ وغیرہ دیکر پالنے لگا لیکن بعد میں ایک گڈریے نے ان کو اپنے گھر لیجا کر پرورش کرنی شروع کی جب یہ بڑے ہوئے تو گڈریوں کی ایک جنگجو جماعت پر حکومت کرنے لگے اب شہر روما بھی آباد ہو گیا ایک مدت تک حکومت کرنے کے بعد رومیولس (۷۱۶ ۔ ۵۳۰ قبل مسیح)

اتفاقاً ایک طوفان میں غائب ہوگیا ان دونو ناموں کو پیش کرنے سے ہوریس اسمتھ کا مقصد یہ ہے کہ ممی کی قدامت کو ظاہر کرے۔ ممی کو اس قدر قدیم آدمی سمجھتا ہے کہ اس کے زمانہ کو طوفان نوحؑ کے بعد ہی کا زمانہ قرار دیکر دریافت کرتا ہے کہ اس وقت جبکہ طوفان کے سیلاب ساری روئے زمین کو سیراب کر گئے تھے اور غالباً ہر جگہ سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہوگا تو نے دنیا کو کس حالت میں دیکھا؟

کمبی سس سلطنت ایران کے بانی سائرس کا بیٹا تھا ۵۲۹ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا اس نے ۵۲۵ سال قبل مسیح میں مصر پر حملہ کر کے اس کو فتح کیا تھا شاعر اسی حملہ کا ذکر کرتا ہے۔

ایپس اُس بیل کو کہتے ہیں جس کو مصری خدا کا اوتار سمجھ کر پوجتے تھے ایک کالا بیل خاص خاص علامات کا لحاظ کرتے ہوئے انتخاب کیا گیا اور اس کے اوتار بنانے کی تقریب نہایت ہی تزک و احتشام سے انجام دی گئی افسوس کہ پچیس برس بھی پنپنے نہ پایا تھا کہ بیچارہ مار ڈالا گیا اور ایک مقدس کوئیں میں دفن ہوا جو ممفس یا مصر کے مندر میں تھا مصر کی قدیم تاریخ آسیرس دیوتا کے افسانوں سے بھری پڑی تھی اس کے مصر میں عالیشان مندر تھے جس کو کمبی سس نے توڑ دیا تھا۔

ایسس مصر کی ایک مشہور دیوی ہے جس کی شکل انسان کی سی تھی اس کو جادوگری کے بھی خاص شعبدے معلوم تھے آسیرس اور ایسس کے متعلق مشہور سیاح اور مورخ ہیرو ڈوٹس کا بیان ہے کہ یہ دونوں ایک زمانہ تک مصر میں بہت زیادہ پجتے رہے ان کے لئے بڑے بڑے مندر بھی بنے ہوئے تھے نہ صرف مصر بلکہ اطالیہ اور روما وغیرہ میں بھی ان کی پرستش ہوتی تھی ان تمام کو کمبی سس یا کمبوجیا نے توڑ دیا تھا اور اسی تاخت و تاراج کی طرف شاعر اس نظم میں اشارہ کرتا ہے

(۴)

ایک ممی سے خطاب

(۱)

ترا قصہ تعجب خیز ہے کوچوں میں تھیبس کے
لگائے تو نے ہیں چکر ہزاروں سال کے پہلے

شکوہ و عظمتِ ممنونیم معراج کمال تھی
ابھی بربادیاں ہونے نہ پائی تھیں زمانے کی

محلات و منار در شوکت و عظمت بداماں تھے
کھنڈر بھی باقیماندہ حیرت افزا ہیں یہاں جن کے

(۲)

خدارا بات کر، مدت سے تو محوِ خموشی ہے!!
زباں تو ہے! پر اس کے نغمہ پر کیوں پردہ پوشی ہے؟

زمیں پر اے ممی! پھر تو کھڑا ہے اپنے پاؤں پر
ترے آگے دوبارہ چاندنی کا ہے وہی منظر!!

مگر تو ہستی بے جسم ہے کوئی نہ سایہ ہے
وہی ہے گوشت اور ہڈی، وہی اعضا ہیں ڈھانچہ ہے

(۳)

بتا اے شبہ ہاں تجھ کو ضرور اب یاد تو ہو گا
کہ ہم بوالہول کی شہرت کا رکھیں کس کے سر سہرا؟

حقیقت سفری نس کی یا کیفن کی الغرض ہے کیا؟
تعلق نام رکھتا کس سے ہے اہرام مصری کا؟

غلط ہے کیا منارہ پامپی منسوب ہے جس سے
بیاں ہومر کا سچ ہے! تھیبس کے کیا سو تھے دروازے؟

(۴)

یہ ممکن ہے کہ تو میسن ہو اپنی زندگانی میں
قسم کیا تجھ کو ہے افشائے اسرار نہانی میں؟

بتا ممنن کے ہیکل میں تھے ایسے کون سے نغمے
مؤید جو بنا کرتے تھے رقص صبحگاہی کے؟

ہے ممکن، ہو تعلق مذہبی فرقہ سے کچھ تجھ کو
تو کیسا ان کے بھیدوں سے ہمیں بھی واقفیت ہو؟

(۵)

وہی ہاتھ آج جو بے جان ڈھانچہ سے بندھا پایا — یہ ممکن محفلِ فرعون میں ساغر بکف ہوگا
کبھی ہومر کی ٹوپی میں اسی نے ڈالا ہو پیسا — گذرگاہِ کوئن ڈیڈو پہ ہو تعظیم کو اٹھا
سلیماں کے اشارے سے بہ نذرِ مسجدِ اقصیٰ — اسی نے مشعلوں کو غالباً اونچا کیا ہوگا!

(۶)

یہ کیا پوچھوں جو تیرے ہاتھ میں ہتیار رہتے تھے — تو کتنے روم کے سرباز اس نے مار ڈالے تھے
ابھی ریمس و ریموس نہیں پیدا ہوئے ہونگے — کہ تیرا مردۂ محنوط ہوگا قبر کے نیچے
ہماری نسل کی بھی آفرینش سے بہت پہلے — ترے افرادِ دنیا سے کبھی کے اٹھ گئے ہونگے!

(۷)

زباں سکڑی ہوئی تیری اگر مہرِ دہن توڑے — تو ہم جانیں کہ کیا دیکھا تھا ان بے نور آنکھوں نے
نظر کیسا یہ آیا ہوگا جب عالم جواں ہوگا؟ — جسے طوفانِ اعظم نے ابھی تر کر کے چھوڑا تھا
جہاں اس وقت بھی پایا تھا قدیم اتنا کہ تھے قاصر — ورقِ تاریخ کے تا ہو بیانِ ابتدا ظاہر

(۸)

ارادہ کیا ہے اے خاموش! کب تک بے زبانی ہے؟ — قسم کھائی ہے کیا کوئی؟ چھپانے کی جو ٹھانی ہے
برائے مہربانی اے ممی! کہہ کچھ تو اپنی بھی — کوئی تو بات ظاہر کر تو اپنے قید خانے کی
ابھی تک عالمِ ارواح میں لی تو نے نیندیں تھیں — بتا کیا کیا وہاں دیکھا ہمیں کس قدر کہیں؟

(۹)

ترے مرنے کو اس صندوق میں رکھا گیا جب سے — زمیں پر آج تک ہم نے عجب ردّوبدل دیکھے!
بنی بھی سلطنتِ روما کی اور آخر کو بگڑی بھی — نئی دنیا ملی، ہم نے پرانی قوم کو کھو دی

مرے گو حکمراں بجھ ملے مٹی میں گو صد ہا — یہ تیرے گوشت میں سے ایک ٹکڑا بھی نہیں بگڑا

(۱۰)

مچا ہنگامۂ محشر ممی! اگرچہ ترے سر پر — جب ایرانی شہنشہ کیمبی سس نے فوج کو لیکر
ترے مدفن کو روندا، آرس، آرس، اپس لوٹا — کیا زیر و زبر اس نے سس کو بھی، پر تو نہیں جاگا
ہلا اہرام کو ڈالا اسیب سے خوف نہ حیرت کے — پُر عظمت شہر ممنن کے در و دیوار سب ٹوٹے

(۱۱)

نہیں کہنے کی باتیں ہیں اگر اسرار قبروں کے — تو اپنی زندگی کی نوعیت ہی کو تو بتلا دے!
ترا دل حرکتیں کرتا تھا جب اس سینہ کے اندر — ترے گالوں پہ بہتے تھے جب آنسو آنکھ سے گر کر
کبھی بچے بھی ان گھٹنوں پہ چڑھتے پیار کرتے تھے؟ — ترا نام و نشاں، عمر اور پیشہ کچھ تو بتلا دے

(۱۲)

سراپا گوشت کے پتلے کہ تو مر کر بھی زندہ ہے — اور اے فانی جہاں کی ایک باقی رہنے والی شے!
تو اپنا تنگ مرقد چھوڑ کر اے موت کے زندانی! — ہمارے سامنے آکر کھڑا سالم ہے اب پھر سے
تجھے صبح قیامت تک پڑیگا منتظر رہنا — کہ اس دن صور اسرافیل سے تو چونک جائیگا

(۱۳)

جب اپنے غیر فانی میہماں کو کھو دیا اس نے — تو پھر بے فائدہ ہو مادہ باقی لئے کس کے؟
ہمیں تو چاہئے روح اپنی ہو محفوظ اور خرم — کہ اپنے جسم سے اس کو جدا ہونا پڑے جس دم
تو گر روندن زمانے کی مٹا دے نام کو اپنے — ہماری غیر فانی روح بالائے فلک چمکے

(مطبوعہ رسالہ تحفہ بابت ماہ محرم سنہ ۱۳۴۲ ہجری)

روح تنقید

(کے متعلق)

ہندوستان کے مستند انشاپردازوں کی رائیں

۱۔ علامہ عبداللہ العمادی رکن دارالترجمہ و ناظر کتب جامعہ عثمانیہ:۔ "..... اسکی بیانہ تالیف کا حصہ ہے جو اپنے موضوع پر اس صدی کی سب سے نمایاں کتاب بھی جا سکتی ہیں۔ فاضل مؤلف نے اس قدر کاوش کی ہے کہ شاید اب ہم جیسے متعلمین بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر سکیں"۔

۲۔ پروفیسر محمد شفیع ایم اے وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور:۔ "..... میری رائے ہے کہ آپ نے ادب اردو میں ایک نفیس اور اعلیٰ کتاب کا اضافہ کیا ہے کتاب میں جابجا مصنف کی غیر معمولی ذہانت اور جدت کے آثار نمایاں ہیں"

۳۔ مولانا عبدالماجد فلسفی بی اے "آپ کی کوشش ادبی تنقیدی دونو حیثیتوں سے قابل داد ہے مجھے حیرت ہے کہ پہلی کوشش میں آپ اس قدر کامیاب کیونکر ہوگئے۔ خدا آپکے قلم میں برکت دے اور آئندہ آپکے ذریعہ بہتر سے بہتر کام پورے کرائے"

۴۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی "روح تنقید آپ نے بڑی محنت اور قابلیت سے لکھی ہے میں آپ کی اس کوشش کو بہت ہی قابل قدر تسلیم کرتا اور اردو لٹریچر کی جانب سے آپ کا شکر گزار ہوں"

۵۔ ہزاکسلنسی راجہ راجایاں سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی سی آئی ای "..... فن شعر میں اصول تنقید پر خیالات کے اظہار کا دائرہ بہت محدود تھا مگر نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے دکن کے ..... زور بی اے نے نہ صرف اس کمی کو پورا کیا بلکہ فن تنقید کے اصول مدون کر کے علم ادب میں قابل داد اضافہ کر دیا جس کے باعث اردو کے انشاپردازوں میں خاص طور سے ممتاز ہے۔ دکن ان کی ذات پر جس قدر ناز کرے کم ہے ..... نقاد کی شخصیت اور تنقید نگاری کے دونو پہلوؤں پر فاضلانہ بحث کی ہے۔ نہایت عمدہ اور بکارآمد کتاب ہے ......"۔

۶۔ ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا بی اے پی ایچ ڈی رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ:۔ کتاب فن نقد شعر میں ہے، خوب لکھی ہے! یہ کوشش نوجوان مصنف کی قابل ستائش ہے"۔

۷۔ مولانا نیاز محمد خان صاحب نیاز فتحپوری ایڈیٹر رسالہ نگار بھوپال:۔ تمام موصولہ کتابوں میں سب سے بہتر تالیف ..... زور بی اے کی ہے جسے روح تنقید کے نام سے انھوں نے شائع کی ہے..... ان تمام عنوانوں کے تحت فاضل مؤلف نے اس قدر اچھا اور پر از معلومات مواد پیش کیا ہے کہ بے اختیار جامع کی محنت و کاوش کی داد دینی پڑتی ہے ..... جناب زور بی اے کا اردو پر احسان عظیم ہے کہ انھوں نے اس فن کے متعلق ایسی بیش بہا تصنیف پیش کی ہے ......"

مُصنّف کی اور کتابیں

۱۔ رُوحِ تنقید: — فنِ تنقید پر اُردو میں سب سے پہلی کتاب جو دو حصّوں پر منقسم ہے پہلا حصہ مبادیِ تنقید پر ہے جس کی دس فصلیں ہیں۔ اسی طرح دوسرے حصہ میں بھی ارتقائے تنقید پر دس فصلیں ہیں کتاب دنیائے اُردو میں بحد مقبول ہوئی ہے اکثر موقر رسائل شلاً معارف، نگار، زمانہ، شمع، ہزار داستان، نیرنگِ خیال، پیمانہ، المعلم، ہمایوں، اردو اور ماڈرن ریویو وغیرہ نے اس کی اہمیت اور فوائد دکھلائے ہیں ان کے علاوہ ملک کے مستند اہلِ قلم شلاً علامہ علی حیدر طباطبائی، مولانا عبدالحلیم شرر، مولوی عبدالماجد فلسفی، خواجہ غلام بھیک نیرنگ، علامہ عبداللہ العمادی، ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا، پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر اولاد حسین شاداں، پروفیسر وحید الدین سلیم، پروفیسر سید اشرف شمسی، مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر وغیرہ نے اس کے متعلق نہایت اچھی رائیں لکھی ہیں، پہلا ایڈیشن قریب الختم صفحات (۳۰۰) قیمت عہ ۱۲؍۔

۲۔ تنقیدی مقالات: — روحِ تنقید کی دوسری جلد جس میں اُردو ادبیات کے بڑے بڑے انشاپردازوں اور شاعروں پر روحِ تنقید کے پیش کردہ اصول کے مطابق تنقیدیں کی گئی ہیں، مرزا غالب، میر تقی میر، میر انیس، میر حسن، خواجہ حالی وغیرہ جیسی عظیم الشان ہستیوں اور ان کے کارناموں کے متعلق معلومات کا ذخیرہ صفحات (۴۰۰) زیرِ طبع۔

۳۔ طلسمِ تقدیر: — ایک نیم تاریخی فسانہ ہے جس میں ہستی کے رجائی اور قنوطی دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے عالمگیر اور تاناشاہ کی لڑائیاں اور اس زمانہ کے حیدرآباد کی حالت کا نقشہ ہو بہو پیش کیا گیا ہے صفحات (۱۶۵) قیمت ۸؍

۴۔ فسانۂ تازیانہ: — ایک نیم تاریخی افسانہ ہے جو شمالی ہند کے مشہور رسالہ نگار میں چھپتا رہا اور اب کتاب کی صورت میں زیرِ طبع ہے۔

۵۔ اُردو کے اسالیبِ بیان: — یہ کتاب دس بارہ فصلوں پر منقسم ہے جس میں اُردو نثر کی ابتدا سے موجودہ انشاپردازوں کے کارناموں تک ہر ایک کے اسلوبِ بیان پر بحث کرنے کے بعد اُردو نثر کے موجودہ رجحانات کا ذکر اور اس کے مستقبل کے متعلق مشورے پیش کئے گئے ہیں (زیرِ طبع)۔

۶۔ سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب: — سات فصلیں ہیں جن میں فارسی علم و ادب کے آغاز سے لیکر سلطان محمود تک اور پھر سلطان محمود کے زمانہ کی علمی و ادبی پیداوار کے متعلق تحقیقی معلومات کے علاوہ محمود کی نسبت جملہ غلط فہمیاں دُور کرکے اس کے عام علمی و ادبی ذوق و شوق اور فارسی زبان پر اس کے احسانات کے ثبوت پیش کیے گئے

